جلد ۹۵ اپریل ۱۹۸۱ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس :

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

کی

اوّلین تصنیف

اَلجہاد فی الاسلام

- جو کہ ۲۳ سال کی عمر میں تحریر کی گئی۔
- جس کی علامہ اقبالؒ نے بھی تعریف و تحسین فرمائی۔
- جسے تحریک قیام پاکستان کے دوران میں مسلمانوں میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے کے لیے کثیر تعداد میں پھیلایا گیا۔
- اسلام کے نظریۂ جہاد اور قانونِ صلح و جنگ کی بہترین اور مکمل تصویر۔
- دیگر مذاہب و اقوام عالم کے جنگی مقاصد و نظریات۔

اور

- بین الاقوامی قوانینِ قتال کا تقابلی مطالعہ
- اسلامی قواعدِ جہاد کی برتری کے تفصیلی دلائل
- جہاد کے مخالفین و معترضین کا مُسکت جواب
- درجنوں کتب و دستاویزات کے مطالعہ کا نچوڑ

۶۰۰ صفحات ○ قیمت : ۳۶ روپے

اِدارہ ترجُمان القرآن
اچھرہ ○ لاہور

فہرست

جلد ۹۵ | اپریل ۱۹۸۱ء مطابق جمادی الاخریٰ ۱۴۰۱ھ | عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ ۔ اے ذیلدار پارک ۔ اچھرہ ۔ لاہور

زرِ سالانہ ۳۰/- روپے ۔ فی پرچہ ۳/- روپے

فون نمبر ——— ۴۱۰۳۱۶

فاروق مودودی پبلشر نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: سید حسین فاروق مودودی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ایک دفعہ پھر مسئلہ رجم پر بحث چھڑ گئی ہے۔
مختلف مدارسِ فکر کے ۲۶ اہلِ علم کا ایک متفقہ بیان ہمارے سامنے ہے۔ اس مختصر بیان کا اہم حصّہ درج ذیل ہے۔

"شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزائے رجم تمام مسلم ائمہ مجتہدین کے نزدیک حدود میں شامل ہے۔ احادیثِ متواترہ اور اجماعِ امت سے واضح طور پر اس کا ثبوت موجود ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بہ طور حد رجم کی سزا سنائی گئی ہے۔"

منصورہ لاہور سے میاں طفیل محمد صاحب نے اپنے بیان میں اسی بات کو ذرا زیادہ زور سے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"ہم نہایت واشگاف الفاظ میں واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ عدالت کا یہ فیصلہ (یعنی سزائے رجم اسلامی حد نہیں ہے) شریعتِ اسلامی کے صریحاً خلاف ہے۔ کیونکہ شادی شدہ زانی و زانیہ کے لیے رجم کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی و فعلی سنّت سے نہایت قطعیت کے ساتھ ثابت ہے۔ اور اسلامی قوانین کا ماخذ جس طرح سے قرآن مجید ہے، اسی طرح سے سنّتِ رسولؐ بھی ہے۔ رجم تعزیری سزا بھی نہیں کہ جس کا نفاذ حکومت یا عدالت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہو بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں رجم کے لیے حد کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لیے جو شخص بھی رجم کو اسلامی احکام کے منافی کہتا ہے یا اس میں ترمیم تنسیخ کرنے یا ایسا مشورہ دینے کی جسارت کرتا ہے وہ سنّتِ رسولؐ کو مسترد کرنے کا

مرتکب ہوتا ہے۔ یہ بڑی الم انگیز بات ہے کہ جن لوگوں کو پاکستان میں اسلامی قوانین کی تنفیذ و تعمیل کی ذمہ داری سونپی گئی ہے وہی ایسے غلط فیصلے کرنے لگیں۔"

راقم نے جہاں تک اس مسئلے پر غور کیا ہے، ملتِ اسلامیہ کی پوری تاریخ میں، دورِ رحمت وسعادت اور خلافتِ راشدہ سے لے کر، بعد کے تمام ماہرینِ قانون وفقہ اور قاضیوں اور مفتیوں تک اگرچہ تسلسل سے رجم کی حد برقرار رہی ہے، اور یہ بات خود اس حد کے واجب القبول اور لازم النفاذ ہونے کی دلیل ہے، مگر ملت میں خوارج و معتزلہ کے دور سے لے کر آج تک جہاں کہیں فتنۂ انکارِ حدیث پایا گیا ہے، وہاں حدِ رجم کے خلاف دلیل بازی ہوتی رہی ہے۔ یہ دلیل بازی پچھلی چودہ صدیوں میں کتاب وسنت کو سرچشمۂ قانون ماننے والے کثیر التعداد عظیم علماء اور ان پر اعتماد کرنے والے عوام کی قوت کی وجہ سے نتیجہ خیز نہیں ہو سکی۔

ہمارے یہاں جب موجودہ معاشرے اور اس کی جدید تعلیم یافتہ قیادت اور خاص طور پر اس کی بیوروکریسی میں مغرب پرستی کا مرض بڑھا اور مغرب ہی ایک طبقے کے لیے اس حد تک معیارِ فیصلہ بن گیا کہ اسی معیار کے مطابق فیصلہ کیا جانا چاہیے کہ اسلام کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ شریعت کے احکام کیا ہونے چاہییں اور ان کی تعبیر وتوضیح کس طرح کی جانی چاہیے؟ ہمارے جدید طبقوں نے جب کسی عقیدے یا حکم کے متعلق اپنے اندر بغاوت کا رجحان دیکھا یا جدید تہذیب کو اس پر چیں بہ جبیں پایا تو اس کے قائم شدہ علمی اور عملی تصور سے بچ نکلنے اور اس کے مفہوم کو مسخ کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اگر احادیث نے تجدد کا راستہ روکا تو اوّلاً انہوں نے یہ کہا کہ یہ احادیث صریحاً عقل کے خلاف ہیں یا قرآن سے ٹکراتی ہیں، لہٰذا صحیح نہیں ہیں۔ پھر جب دیکھا کہ یہ مشکل تو تقریباً ہر مسئلے میں پیش آتی ہے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شارعانہ حیثیت کو ختم کیا، ان کے منصبِ تبیین وتوضیحِ قرآن کو چھینا اور ان کو قرآنی حقائق کی عملی تفسیر پیش کرنے والے واجب الاتباع صاحبِ اسوہ ہونے کے مرتبہ سے محروم کیا (نعوذ باللہ)۔ آخری تدبیر یہ نکالی کہ رسولِ خدا کی احادیث سے جو احکام ثابت ہیں وہ آپ نے بحیثیت امیر اپنے زمانے کے لیے دیے تھے، ہم سے کیا سروکار۔

پھر جب آیات سے اُن کی مسلمہ عملی تفصیل الگ کر دی گئی تو اِس گروہ نے کہا کہ یہ خلاء جو پیدا ہو گیا ہے اسے علمی طور پر ہم پورا کریں گے اور سیاسی اور انتظامی طور پر یہ کام خدا و رسولؐ کے کرنے کا ہے اور خدا و رسولؐ کے معنی "مرکزِ ملت" ہیں اور "مرکزِ ملت" کا مطلب سربراہِ ریاست یا معاشرے کی قوتِ حاکمہ (SOVERIEGN POWER) ہے۔ پہلی بار ان معنوں میں "مرکزِ ملت" کا اطلاق سابق گورنر جنرل ملک غلام کی حکومت پر کیا گیا۔

آیئے ذرا اس طبقے کے طرزِ استدلال ملاحظہ فرمایئے:

"قرآن کریم میں زنا کی سزا رجم (سنگسار) کہیں نہیں آئی۔ نہ شادی شدہ کے لیے نہ غیر شادی شدہ کے لیے۔ سنگسار کی سزا بعد میں وضع کردہ ہے۔ (واقعاتی تاریخ میں سے اس زمانے کا تعین ہونا چاہیے تھا اور وضع کرنے والے اشخاص کا بھی۔ف۔ح) اور اُسے منسوب کیا جاتا ہے حضور رسالت مآب کی ذاتِ گرامی کی طرف۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسولؐ اللہ (معاذ اللہ) قرآن کے احکام کے خلاف بھی فیصلے دیا کرتے تھے۔"

(قرآنی فیصلے، مطبوعہ ادارۂ طلوع اسلام کراچی۔ سال ۱۹۵۳ء۔ ص ۱۷۷)

جی ہاں! حضورؐ نے نماز اور زکوٰۃ کی جو تفصیلات دی ہیں، وہ سب بھی قرآن پر اضافہ ہیں۔ ایک ایسے حکم کو جس کے کسی بھی شکل میں ادا کر لینے کی آزادی حاصل تھی، اُسے متعین صورتوں کا پابند بنا کر (نعوذ باللہ) ان حضرات کے فلسفے کی رُو سے قرآن پر اضافہ کیا، بلکہ حقیقت میں مخالفت کی۔ اسی طرح سارق اور سارقہ خواہ ایک دمڑی کے معاملے میں مجرم ہوں، خواہ بنک سے توڑے اُٹھا لے جائیں، قرآن کی رُو سے اُن کے ہاتھ کاٹ دیتے چاہییں۔ کوئی پابندی نہیں کہ ہاتھ کی تعریف کیا ہے، یعنی کہاں تک ہاتھ شمار ہوگا۔ (آیت وضو سامنے رہے) اور کیسے کاٹا جائے، ایک ٹوکے سے یا آرے سے، یا کدال کسی سے؟ ان باتوں کی وضاحت فرما کر حضورؐ نے کیا کتاب اللہ میں اضافہ کیا ہے یا اس کی مخالفت کی ہے؟

اصل قصہ یہ ہے کہ یہ حضرات رسولؐ کو شارع (مامور من اللہ) مانتے ہی نہیں کہ الفاظِ قرآن کے علاوہ رسولؐ خدا کے کسی فرمان یا حکم کو ثابت ہونے پر اس شعور سے قبول کر لیں کہ یہ اُس خدا کی مفسرِ قرآن

صاحبِ اسوۂ حسنہ اور مطاع باذن اللہ کا حکم ہے جسے اپنے دل کے مزعومات اور رواجی فلسفوں اور غالب تہذیب کے تقاضوں کو ٹھکرا کر تسلیم کرنا ہے۔[۱]

اس وقت متعدد اطراف میں خاص خاص منکرینِ حدیث اپنے مورچوں میں بیٹھے ہیں اور سیکولر مزاج مغربی طبقے کو اپیل کرنے والے مباحث چھیڑ رہے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اسلامی نظام کے پرچے کی وجہ سے خوف اور بیزاری کا جو غبار اُن کے دلوں پہ چھایا ہوا ہے وہ چھٹ جائے۔ ہمارے علماء خوب سمجھ لیں کہ اس وقت اسلامی نظام کا راستہ روکنے کے لیے دنیا بھر کی مخالفِ اسلام قوتوں کی پشت پناہی چار محاذوں کو حاصل ہے۔ ایک[۱] ثقافتی محاذ، دوسرا[۲] دوش بدوش کا نعرہ لگانے والی مرعوبِ فرنگ خواتین کا محاذ (جنہیں موجودہ حکومت محض دوپٹہ سر پہ رکھنے کے لیے بھی راضی نہیں کر سکی) تیسرا[۳] کمیونسٹ تخریب پسند سیاست بازوں کا محاذ اور چوتھا[۴] منکرینِ حدیث کا محاذ۔

اس چوتھے محاذ کے سامنے نقشہ یہ ہے کہ اوّل تو اسلامی قوانین کے نفاذ کی رفتار بڑی سست ہے اور مجموعی نظام کے بجائے متفرق احکام ایک ایک کر کے سامنے آ رہے ہیں، دوسری طرف جن شکلوں میں قوانین مدوّن ہو رہے ہیں اُن میں رخنے رہ جاتے ہیں، تیسرے جس عدالتی نظام اور پولیس کے ذریعے ان کا عملی نفاذ ہوتا ہے اس کی ایک سطح پہ اسلامی قوانین کے لیے انقلابی انداز کی ذہنی تیاری موجود نہیں ہے اور دوسری سطح پہ جو قانون چلتا ہے اُس کا عملاً حلیہ بگڑ جاتا ہے۔

ایسے حالات میں چاہیے کہ علماء مسئلہ رجم پہ ایسی مدلّل بحثیں سامنے لائیں کہ جن خاص طریقوں سے ذہنی بے اطمینانی پیدا کی جا رہی ہے، اُن کا توڑ ہو جائے اور اہلِ علم میں بھی اور عوام میں بھی جو ٹیڑھے سوالات پیدا کیے جا رہے ہیں، اُن کا شافی جواب سامنے آ جائے۔ میرے خیال میں ذہنی ابتری کے دَور میں یہ کافی نہیں ہے کہ اتنی بات زور سے کہہ دی جائے کہ شروع سے آج تک فکری طور پر بھی اُمت مسئلہ رجم

---

[۱] کاش کہ یہ گروہ رسول اللہ سے اتنا وفادار ہوتا کہ آپ کے احکام کو کم سے کم کسی مارشل لاء کے ڈکٹیٹر یا کسی جمہوری صدر یا وزیر اعظم یا پارلیمنٹ کے جاری کردہ احکام کی طرح واجب الاطاعت سمجھتا۔ حکومت کے قوانین و احکام اور دفتری ضابطوں کی تو من مانی تعبیرات کر کے انہیں کھیل بنانے کی جرأت نہیں، لے دے کے ساری عقل اور ساری آزادیٔ خیال کا استعمال حضورؐ کے ارشادات کے خلاف کیا جاتا ہے۔

پر منحصر رہی ہے اور عملی طور پر بھی اس کا نفاذ جاری رہا ہے۔

مثال کے طور پر ریٹائرڈ جسٹس یعقوب علی خاں کا ایک مضمون میرے سامنے ہے جو پاکستان ٹائمز (مؤرخہ ۲ مارچ ۱۹۸۱ء) میں چھپا ہے، اور یہ ایران کے حوالے سے اجرائے حدود کے متعلق ایک بحث پر مبنی ہے جو نیوز ویک مؤرخہ ۱۴ جولائی ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی تھی۔

جسٹس موصوف کے بحث و استدلال کو تو یہاں درج کرنا مشکل ہے۔ البتہ ان کے چند اہم نکات یا دعاوی درجِ ذیل ہیں۔

۱۔ اسلام سے پہلے سنگین، وحشیانہ اور ظالمانہ سزائیں رائج تھیں۔ مگر اسلام چونکہ انسانیت سکھانے آیا تھا لہٰذا اس نے دوسرے شعبوں کی طرح جرم و سزا میں بھی تبدیلیاں پیدا کیں۔ اسلام اور صاحبِ اسلام کی رحمۃ للعالمینی کے خلاف ہے کہ وہ مجرم کو پتھر مار مار کر ہلاک کرنے کی سزا دے۔ ایسی صورت میں کہا جاسکتا ہے کہ اسلام وحشیانہ اور ظالمانہ سزائیں دیتا ہے۔

۲۔ سورۂ نور کی آیت بسلسلہ سزائے زنا (آیت ۲) میں چونکہ زانی اور زانیہ کے الفاظ "ال" کے ساتھ آئے ہیں، لہٰذا آیت ہر قسم کے ارتکابِ زنا کو محیط ہے۔ زانی و زانیہ کے کنوارا یا نکاحی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یعنی سب کی سزا سو کوڑے رہے گی (کوئی اور شخص کہہ سکتا ہے کہ سو کوڑے مارنا وحشیانہ سزا ہے پھر کیا ہوگا۔ نظریہ رحمۃ للعالمینی تو کوڑوں سے بھی سخت مجروح ہوگا۔)

۳۔ رجم کے متعلق جتنی احادیث ہیں، احادیث میں حدِ رجم کے نفاذ کے جو واقعات اور صحابہ کرامؓ کے ارشادات مذکور ہیں، وہ سب سورۂ نور کی آیت نمبر ۲ کے نازل ہونے سے پہلے کے ہیں۔

۴۔ اگر حدِ رجم کے قرآن میں مذکور نہ ہوتے ہوئے اس کو دین یا قرآن کا تقاضا کہا جائے تو اس کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ قرآن تمام امور میں اپنی جگہ مکمل نہیں ہے۔

۵۔ سورۂ نور کی مقرر کردہ حد کو حدیث سے تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔

۶۔ قرآن میں ۹ مقامات پر زنا موضوعِ کلام ہے۔ کسی ایک جگہ بھی رجم کا ذکر نہیں۔

۷۔ خوارج اور معتزلہ کے مفسرین کے حوالے سے یہ دلیل بھی دی گئی ہے کہ سورہ نساء میں چونکہ یہ حکم

ہے کہ اگر کوئی کنیز زنا کا جرم کرے تو اسے آزاد عورت کے مقابلے میں آدھی سزا دی جائے اور رجم کی سزا کا آدھا کوئی معنی نہیں رکھتا، لہٰذا رجم شرعی حد نہیں ہے۔

میں یہاں ان نکات کا جواب نہیں دے رہا، بلکہ ان کو علماء کے سامنے رکھ رہا ہوں کہ یہ ہیں وہ فکری الجھنیں جو کچھ ذہنوں میں ہیں اور وہ انہیں دوسروں تک منتقل کرتے ہیں۔ صرف نکتہ نمبر ۷ ایسا ہے کہ چونکہ وہ بہت عام حلقوں میں بہ آسانی غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے۔ لہٰذا میں خاص اس کا جواب تفہیم القرآن سے نقل کر رہا ہوں۔ یہ سورۂ نساء کی آیت نمبر ۲۵ پر حاشیہ نمبر ۴۶ ہے۔

"سرسری نگاہ میں یہاں ایک پیچیدگی واقع ہوئی ہے جس سے خوارج اور ان دوسرے لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہے جو رجم کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ —— اگر شادی شدہ عورت کے لئے شریعتِ اسلام میں زنا کی سزا رجم ہے تو اس کی نصف سزا کیا ہو سکتی ہے جو لونڈی کو دی جائے؟ لہٰذا یہ آیت اس بات پر دلیل قاطع ہے کہ اسلام میں رجم کی سزا ہے ہی نہیں —— لیکن ان لوگوں نے قرآن کے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ اس رکوع میں لفظ مُحْصَنٰت (محفوظ عورتیں) دو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایک شادی شدہ عورتیں جن کو شوہر کی حفاظت حاصل ہو، دوسرے خاندانی عورتیں جن کو خاندان کی حفاظت حاصل ہو، اگرچہ وہ شادی شدہ نہ ہوں۔ آیت زیر بحث میں مُحصنات کا لفظ لونڈی کے بالمقابل خاندانی عورتوں کے لئے دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ نہ کہ پہلے معنی میں۔ جیسا کہ آیت کے مضمون سے صاف ظاہر ہے بخلاف اس کے لئے لونڈیوں کے لیے مُحصنات کا لفظ پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے اور صاف الفاظ میں فرمایا کہ جب انہیں نکاح کی حفاظت حاصل ہو جائے (فَاِذَآ اُحْصِنَّ) تب ان کے لئے زنا کے ارتکاب پر وہ سزا ہے جو مذکور ہوئی۔ اب اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ خاندانی عورت کو دو حفاظتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک خاندان کی حفاظت جس کی بنا پر وہ شادی کے بغیر بھی محصنہ ہوتی ہے۔ دوسری شوہر کی حفاظت جس کی وجہ سے

اس کے لیے خاندان کی حفاظت پر ایک اور حفاظت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے لونڈی جب
تک لونڈی ہے محصنہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کو کسی خاندان کی حفاظت حاصل نہیں ہے۔ البتہ نکاح
ہوتے پر اس کو صرف شوہر کی حفاظت حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی اَدھوری۔ کیونکہ شوہر کی حفاظت
میں آنے کے بعد بھی نہ تو وہ ان لوگوں کی بندگی سے آزاد ہوتی ہے جن کی مِلک میں وہ تھی، اور
نہ اُسے معاشرت میں وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو خاندانی عورت کو نصیب ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا
اُسے جو سزا دی جائے گی وہ غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے آدھی ہو گی، نہ کہ
شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے۔ نیز یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ سورۂ نور
کی دوسری آیت میں زنا کی جس سزا کا ذکر ہے وہ صرف غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کے
لیے ہے جن کے مقابلہ میں یہاں شادی شدہ لونڈی کی سزا نصف بیان کی گئی ہے۔ رہیں
شادی شدہ خاندانی عورتیں تو وہ غیر شادی شدہ محصنات سے زیادہ سخت سزا کی مستحق
ہیں کیونکہ وہ دوہری حفاظت کو توڑتی ہیں۔ اگرچہ قرآن اُن کے لیے سزائے رجم کی
تصریح نہیں کرتا۔ لیکن نہایت لطیف طریقہ سے اُس کی طرف اشارہ کرتا ہے جو بلید الذہن
لوگوں سے مخفی رہ جائے تو رہ جائے، نبی کے ذہنِ رسا سے مخفی نہیں رہ سکتا۔"

یہ عبارت درج کرتے ہوئے مجھے افسوس ہوا کہ جسٹس یعقوب علی جیسے حضرات بھی زیادہ گہرائی
تک کاوش و مطالعہ نہیں کرتے۔

ایک اہم بحث جسٹس صاحب (اور دوسرے حضرات) کی تحریروں میں ان روایات کی بُنیاد پر
اُٹھائی گئی ہے کہ آیت رجم نازل ہوئی تھی مگر منسوخ التلاوۃ ہو گئی۔ اس مغالطہ انگیز جواب کی تردید
میں اور متعلقہ روایات کی تاویل میں رسائل و مسائل (از مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور، حصہ ۳
کی طویل بحث (از صفحہ ۱۴۱) سے کسی بھی سلیم الطبع آدمی کو بڑی مدد مل سکتی ہے۔ جسٹس صاحب بھی ملاحظہ فرمالیں۔

میری گذارشات کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ تجدد کی پیدا کردہ ظلمتِ تشکک کا ازالہ کرنے کے لیے علماء کو
مخالفانہ دلائل کا قلع قمع ذرا زیادہ تفصیل سے کرنا چاہیے تھا۔

پاکستان میں
نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیل کی حکمتِ عملی

ڈاکٹر سعید اللہ قاضی

(ڈاکٹر سعید اللہ قاضی ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامیات جامعہ پشاور نے یہ مقالہ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد کے ایک سیمنار کے لیے تحریر کیا)

پاکستان میں نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیل کے سلسلے میں کچھ تجاویز پیش کرنے سے پہلے اُن نقائص کی نشاندہی ضروری ہے جو ہمارے مروجہ نظامہائے تعلیم میں موجود ہیں۔

مروجہ دو نظامہائے تعلیم

وطنِ عزیز میں اس وقت دو قسم کے نظامہائے تعلیم پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جس پر ہمارے دینی مدارس عمل پیرا ہیں، اور جس سے صرف مذہبی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ دوسرا وہ جو ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رائج ہے اور جو مذہب کے سوا ہماری پوری قومی زندگی پر حاوی ہے۔ ان دونوں نظاموں کے درمیان جو خلیج حائل ہے اُسے صرف اس طرح دُور کیا جا سکتا ہے کہ دونوں نظاموں میں جو نقائص موجود ہیں، اُن کو دُور کرکے اُن کی جگہ ایک ایسا نظام تیار کیا جائے جو ملکی ضروریات کو کما حقہ پورا کر سکے۔ اور جس کو رائج کرکے تعلیم کے بارے میں دوئیت کا عمل ختم کیا جائے جو صدیوں سے ہمارے ہاں جاری ہے۔

جہاں تک مروجہ مذہبی نظامِ تعلیم کا تعلق ہے، اس کی افادیت ختم نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ اس نظام کے تحت جو طلبہ مدارس سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں وہ صرف مسجدوں کے امام بن جاتے ہیں یا پرائمری سکولوں میں تدریسی فرائض انجام دیتے ہیں۔ مزید برآں اُن کا اکثر وقت فروعی اختلافات اور جھگڑوں میں صرف ہوتا ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی وجہ سے عوام کو بعض دینی مسائل معلوم ہو جاتے ہیں اور ان کے کچھ مذہبی رسومات کی انجام دہی ہوتی ہے۔ لیکن ان فائدوں کے مقابلے میں جو مذہبی تفرقہ ان کی وجہ سے معاشرہ میں پیدا ہوتا ہے وہ ان فائدوں کی بہت زیادہ قیمت ہے۔

اس کے مقابلے میں جو انگریزی نظامِ تعلیم ہمارے ہاں رائج ہے وہ وہی ہے جو انگریزوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے وضع کیا تھا۔ وہ اس نظام کے تحت ایسے لوگ پیدا کرنا چاہتے تھے، جو اُن کے آلۂ کار ہوں اور صرف اُن کی حکمتِ عملی کے تحت کام کرتے ہوں۔ ان میں نہ قومیت کا جذبہ ہو اور نہ دین کے ساتھ اُن کا لگاؤ ہو، بلکہ اپنے آپ کو پاکستانی یا مسلمان کہلانے میں شرم محسوس کرتے ہوں۔ اس قسم کے نظامِ تعلیم کے تحت جو لوگ بھی تیار ہوتے گئے وہ دین سے دُور ہونے کے ساتھ ساتھ خدا پرستی کے نقطہ نظر سے بھی تہی دامن ہوتے گئے۔ وہ جو مضمون بھی پڑھتے صرف مادی مفاد کی خاطر پڑھتے۔ خالقِ کائنات کا تصور ان مضامین سے کلیتاً منفی کر دیا گیا تھا۔[1]

بھلے اور بُرے کی تمیز اُن میں نہیں رہی۔ مغرب کی ہر چیز اُن کو معیاری نظر آتی۔ مغربی جمہوریت نے اُن کو مسحور کر دیا۔ اور اُس کے ساتھ بغیر کسی معقول وجہ کے چمٹے رہے۔ اسلام کو وہ ایک ایسا مذہب سمجھنے لگے جو بقول اُن کے وقت کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ وہ اپنی نادانی اور جہالت کی وجہ سے اسلام اور مروّجہ علوم کو ایک دوسرے کی ضد سمجھنے لگے۔

اگر غور کیا جائے تو ہمارے معاشرتی اور ملّی حالات میں اس قسم کے نظریات کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ اس قسم کے نظریات کی اندھی تقلید اور تائید ملک و قوم کے لیے کس طرح مفید ہو سکتی ہے۔[2]

حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ اس نظامِ تعلیم کے تحت تیار ہونے والے لوگوں کے مغربی آقاؤں کے اندر جو بنیادی انسانی اخلاقیات موجود ہیں اور جن کے بغیر کسی قوم کا ترقی کرنا تو درکنار زندہ رہنا بھی

[1] ابوالاعلیٰ مودودی۔ اسلامی نظامِ تعلیم، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۵ - ۱۱

[2] شفیق جالندھری۔ نظامِ تعلیم میں اسلامی روح کیسے پھونکی جائے۔ مطبوعہ عزمِ نو، اسلامی نظامِ تعلیم نمبر اشاعت ۱۹۶۹ء لاہور۔

بعید از فہم ہے، یہ اُن سے بالکل عاری ہیں۔ یہ صرف اُن کے سلبی صفات کے عاشق ہیں اور ایجابی صفات کے قریب ہی نہیں جاتے۔

راقم الحروف نے خود دیکھا ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان جب تعلیم کے لیے مغرب کا چکر لگاتے ہیں تو ان کی نظر صرف اُس کی ظاہری چمک دمک پر پڑتی ہے اور اُس کے اندر جو بنیادی انسانی اخلاقیات ہیں اُن کے بارے میں وہ جاننے کی کوشش کرتے ہی نہیں۔ بس چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات کے مصداق اپنے چند سال وہاں عیش و عشرت میں گذار کر واپس آ جاتے ہیں۔ واپسی پر وہ ہر مغربی چیز کی تعریف کرتے ہیں، سوائے اُن بنیادی انسانی اخلاقیات کے۔ اِس قسم کے، خدا پرستی اور اسلامی اخلاق سے عاری لوگ، مُلک و ملّت کے لیے کون سے کارنامے انجام دیں گے۔ اِن سے لادینیت کے سوا مُلک و ملّت کو اور کیا ملے گا۔

ان لوگوں میں نہ فرض شناسی ہے اور نہ وقت کی پابندی۔ اِن کی زندگی میں کوئی واضح مقصد نہیں ہوتا۔ یہ صرف بنگلے، موٹر اور معاشرے میں اُونچا مقام حاصل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ اپنے اس گھٹیا مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ سب کچھ کرنے پہ تیار رہتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں سے ملک و ملّت کو جو توقعات ہو سکتی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں ہیں[۱]

نظامِ تعلیم کے بنیادی امور

اسلامی نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیل کے لیے پہلا قدم یہ اُٹھانا ہوگا کہ مروجہ دونوں نظامہائے تعلیم کو ختم کیا جائے اور ان دونوں کی جگہ ایک ایسا نظامِ تعلیم رائج کیا جائے جو مذکورہ نقائص سے پاک ہو اور جو ایک مسلمان قوم کی حیثیت سے ہماری ضروریات کو پورا کر سکے[۲]۔ اس نظامِ تعلیم کا نقشہ کچھ یوں ہے۔

ایک مسلمان قوم کی حیثیت سے ہمارا ایک خاص طرزِ فکر یعنی ثقافت ہے۔ اِس طرزِ فکر کے مطابق ہمارا پورا انتظامِ زندگی قائم ہونا چاہیے۔ ہماری درس گاہوں میں نظامِ تعلیم اِسی مخصوص طرزِ فکر کی بنیاد پر تشکیل پانا چاہیے[۳]

۱؎ اسلامی نظامِ تعلیم ص ۱۲ ۲؎ ایضاً ص ۱۷

۳؎ ابوالاعلیٰ مودودی۔ تنقیحات، لاہور ۱۹۷۲ء ص ۲۷۶

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ دین اور دنیا کی تفریق ختم ہونی چاہیے کیونکہ یہ ایک غیر اسلامی فکر ہے۔ دینی اور دنیوی تعلیم کے تصور سے اسلام ناآشنا ہے۔ اسلام میں ہر علم اسلامی ہے۔ یہ تو علم حاصل کرنے والے کا رویہ ہوتا ہے جو کسی علم کو ان دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اگر کسی بھی مضمون کو ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے پڑھا جائے تو وہ ایک دینی علم ہوگا، دنیوی نہیں ہوگا۔[۱]

تیسری بنیادی چیز جو ہمارے نظام تعلیم میں ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تشکیلِ سیرت کو کتابی علم کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دی جائے۔ ہمارے نوجوانوں کے اندر علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی اخلاق بھی پیدا ہوں تاکہ وہ "مسلمان سیاست دان"، "مسلمان فلاسفر"، "مسلمان مؤرخ" اور "مسلمان طبیب" کہلا سکیں۔[۲]

چوتھی بنیادی چیز یہ ہے کہ مغربی طرزِ فکر اور نظامِ تعلیم کی وجہ سے ہمارے نوجوانوں کا اخلاقی انحطاط ہو رہا ہے۔ جب ہمارا نوجوان یہ دیکھتا ہے کہ سنٹرل ماڈل اسکول یا مسلم ماڈل اسکول کا طالب علم ہونا کنفیڈرل اور سینٹ اینتھونی اسکول کے طالب علم ہونے کے مقابلے میں احساسِ کمتری میں مبتلا کرتا ہے، وہاں کی گپ شپ اور ٹھاٹھ باٹھ کے مقابلے میں ہمارے مشرقی مدارس میں دی گئی نظری اور فکری، اساسی اور دینی معلومات کو ہیچ سمجھا جاتا ہے۔ اور ملازمتوں کے لیے تقرر کرنے والے کمیشن بھی ان ہی اداروں کو ترجیح دیتے ہیں تو پھر یہ دیسی اور مشرقی طالب علم اُن اداروں کو خیرباد کہہ کر اِن اداروں کے گپ شپ اور ٹھاٹھ باٹھ کو اپنانے کے لیے کمربستہ ہو جاتا ہے جن میں اُس کو اپنا مستقبل درخشاں نظر آتا ہے۔ اس لیے مغربی نظامِ تعلیم زوال پذیر ہونے کے بجائے برابر ترقی کر رہا ہے، جس کی وجہ سے ہماری نظریاتی بنیاد کمزور ہو رہی ہے۔ اس مغربی طرزِ فکر، مغربی زندگی اور مغربی نظامِ تعلیم کو شکست دینے اور اسلامی اور مشرقی نظام کو ترقی دینے کے لیے ہمیں اپنے اداروں اور تعلیمی نصابوں میں بہت سی تبدیلیاں کرنی ہوں گی۔ اِس کے بغیر ہمارا اندازِ زیست نہ تو اسلامی بن سکتا ہے اور نہ پاکستانی۔ اِن اداروں کی بیخ کنی کر کے جو یورپین طرز کے ادارے کہلاتے ہیں، ان کا مغربی ڈھانچہ بدلنا ہوگا۔ مغربی ڈھانچے میں مغربی سربراہوں،

---

[۱] اسلامی نظامِ تعلیم ص ۱۷ - ۱۸　　[۲] ایضاً

اُستادوں، ان کے نصاب، ذریعۂ تعلیم، یونیفارم، معاشرتی زندگی وغیرہ تمام چیزوں کی تبدیلی شامل ہے۔

نصاب:-

مقصدِ تعلیم حاصل کرنے کے لیے موزوں نصاب کا انتخاب ضروری ہے۔ اسلامی اور قومی نصاب بنانے کے لیے ایسے افراد کی خدمات حاصل کی جائیں جن کے دل اسلامی، قومی اور ملی جذبے سے سرشار ہوں جو صرف مغربی اندازِ فکر کے ماننے والے نہ ہوں، بلکہ دینی، قومی اور ملی درد رکھنے والے ہوں۔ پرائمری اداروں کے نصاب کو اسلامی اور قومی بناتے وقت یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ بچوں کے ذہن میں توحید کا تصور اور رسالت کا مقام ذہن نشین کرایا جائے۔ اُن کے ذہن کو شرک و بدعت سے صاف کیا جائے۔ اُن کو ارکانِ اسلام کے ساتھ ساتھ اجزائے ایمان بھی بتا دیے جائیں۔ ان کے ساتھ اسلامی تصورات، ملک و ملت اور قوم سے محبت کا درس دیا جائے۔ ملک و قوم کی اہمیت اور ایک قوم کے فرد کے فرائض اور ذمہ داریوں سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ مغربی اندازِ فکر سے ہٹ کر خالص اسلامی نقطۂ نظر کو اپنائیں [1]

پرائمری مراحل سے گزر کر جب بچہ وسطی اور ثانوی مدارس میں داخل ہو تو یہاں کے نصاب میں توحید و رسالت کے بنیادی عقائد کے ساتھ ساتھ حبِ وطن اور قومی فرائض سے بھی اُسے روشناس کرایا جائے۔ یہاں دفاعِ وطن کا جذبہ اور جہاد فی سبیل اللہ کا نظریہ اُس کے دل میں اس انداز سے راسخ کرنا چاہیے کہ وہ جہاد کو عملی طور پر قبول کر کے نہ صرف توپ و تفنگ کے ذریعے سے بلکہ جان و مال اور زبان کے ذریعے بھی اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرے۔ اس طرح غیراللہ کا خوف، ظالم حاکم کا ڈر اور بے یقینی کی کیفیت بچے کے ذہن سے ختم ہوگی اور اس کے کردار میں پختگی اور لچک پیدا ہوگی۔

جب طالب علم کالج کی زندگی میں داخل ہو تو یہاں اُسے ایک باہمت اور صالح جوان کی حیثیت سے ان تمام باتوں کا گرویدہ بنایا جائے جو اُسے پرائمری اور ثانوی مراحل سے سکھائی

[1] ڈاکٹر عبیداللہ خان۔ اسلامی نظامِ تعلیم کی اہمیت۔ مطبوعہ عزم نو، ص ۹۵۔۹۶۔

جا چکی ہیں۔ اب اسے جہاد کی روح سے مکمل طور پر باخبر کیا جائے۔ اس کی عملی زندگی میں معاشرہ کے جن جن افراد سے اس کا واسطہ پڑے ان کے حقوق سے آشنا کرانا چاہیے۔ اس طور پر کہ طالب علمی کے زمانہ ہی سے وہ ان فرائض کی بجا آوری میں دلچسپی لینے لگے۔ طالب علم میں انسانی عظمت کے ایسے نشان پیدا کرنے کے لیے کہ جن سے دوسرے رہنمائی حاصل کر سکیں، اسے یہ تمام باتیں قرآنی احکام اور فرمانِ رسولؐ کی روشنی میں سمجھانی چاہییں۔

یونیورسٹی کے مرحلہ سے گزرتے وقت سب سے پہلے اسلامی اقدار کا تحفظ اس کے ذہن نشین کرانا چاہیے۔ وہ ان تمام اسلامی اصولوں اور قواعد و ضوابط کو اپنی زندگی کی نشو و نما اور کامیابی کے لیے ضروری سمجھے جنہیں وہ پرائمری تعلیم سے لے کر کالج کی تعلیم تک سیکھتا رہا ہے اور انہیں انسانی معراج اور ترقی کے رہنما اصولوں کے طور پر اپنائے اور یہ سمجھ سکے کہ میرے وطن کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں کس طرح دوسری قوموں سے مقابلہ کرنا ہے۔ وطن کے تحفظ کے لیے کن کن ذرائع کو بروئے کار لانا چاہیے۔ کردار کو پختہ اور اچھا بنانے کے لیے کن کن وسائل کو کام میں لا کر اپنے اندر اچھے اوصاف پیدا کرنے ہیں قرآن و سنّت کی روشنی میں کس طرح صحیح سمت کا تعین کرنا ہے۔[1]

ماہرینِ تعلیم کو نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم مرتب کرتے وقت طالب علم کے ذہنی اور جسمانی ارتقاء کو پیش نظر رکھنا ہوگا اور اس کی طبعی اور نفسیاتی عمر اور مختلف علوم میں مطابقت پیدا کرنا ہوگی تاکہ طالب علم کو خود عبارت کرنے اور پیش قدمی کرنے کا شوق پیدا ہو، خاص طور پر دینی تعلیم کو اس طور پر ترتیب دیا جائے کہ عمر کے لحاظ سے طالب علم کے کام آئے اور وہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنی زندگی کی کامیابی اور آخرت کی فلاح کے لیے انہیں ضروری سمجھ کر ہر طرح کی قربانی اور ایثار کے لیے آمادہ و تیار ہو۔[2]

اس طرح دوسرے تمام مضامین کا انداز اگر اسلامی نہ بنایا جائے تو اسلامیات کے پیریڈوں کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس ضمن میں استاد محمد قطب اپنے ملک مصر کی مثال کچھ اس طرح پیش کرتے

۱؎ ڈاکٹر عبید اللہ خان۔ اسلامی نظامِ تعلیم کی اہمیت۔ مطبوعہ عزم نو ص ۹۷، ۴۸ - ۹۸ ۴

۲؎ محمد احمد صدیقی۔ اقبال کے تعلیمی نظریات۔ کراچی۔ ۱۹۶۵ء ص ۱۵۷، ۱۷۹، ۱۸۱، ۱۸۲، ۲۲۲

ہیں کہ: "وہاں اسلامیات کے پیریڈ میں بچوں کو پڑھایا جاتا ہے کہ فرعون خدا کا باغی تھا، ظالم تھا، مگر تاریخ کا اُستاد اسے ایک عظیم انسان کے روپ میں پیش کرتا ہے، جو واقعی اتنا اعلیٰ و برتر تھا کہ خدا بننے کے قابل تھا۔ اِسی طرح دینیات کی کتابوں میں خدا کے خالق و مالک ہونے کا ذکر موجود ہوتا ہے مگر دوسرے علوم میں نیچر کو خدائی رُتبے پر فائز کیا جاتا ہے۔ سائنسی علوم میں طبعی قوانین اور نیچر کو اٹل قرار دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ خدا بھی ان کو بدلنے پر قادر نہیں ہے۔ اسی سبب سے مغربی ذہن معجزات کا انکار کرتے ہیں کہ یہ امر علم طبیعیات کے خلاف ہے۔ اِس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کا ذہن تضاد کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ اِدھر کا رہتا ہے نہ اُدھر کا۔"[1]

دینیات کو پورے نصاب میں اس طرح اُتارنا ہوگا کہ وہ اس کا دورانِ خون، اس کی رُوح، اس کی بینائی و سماعت، اس کا احساس و ادراک اور اس کا شعور و فکر بن جائے اور مغربی علوم و فنون کے تمام صالح اجزا کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی تہذیب کا جزو بناتا چلا جائے۔

اس طرح مسلمان فلسفی، مسلمان سائنسدان، مسلمان ماہرین معاشیات، مسلمان مقننین، مسلمان مدبرین غرض تمام علوم و فنون کے مسلمان ماہر پیدا کیے جاسکیں گے۔[2]

جناب عبدالحمید ہاشمی نے اپنے مقالے "مضامین کی نظریاتی تعلیم" میں نصاب کے بارے میں ایک نقشہ پیش کیا ہے جس سے تمام سائنسی و فنی اور معاشرتی علوم کی تدریس کے لیے ایک ایسا نصاب تشکیل دیا جا سکتا ہے جو اسلامی ہو۔

مصنف لکھتا ہے "تمام علوم کو اسلامی رنگ میں پیش کرنے کے لیے ہمیں قرآن پاک کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور اس میں آیات ڈھونڈ کر نکالنی ہوں گی اور طلبہ کو بتانا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں اس مضمون کے بارے میں کیا کچھ فرماتا ہے تاکہ طلبہ کا ذہن مادے کے بجائے خدا کی ذات کی طرف مائل ہو۔ اس طرح احادیثِ نبوی میں جو مواد پایا جاتا ہے، اُسے طلبہ کی رہنمائی کے لیے نصاب میں شامل کیا جائے۔ مثلاً سائنس اور سائنس کے بنیادی شعبوں کے بارے میں۔

---

[1] محمد قطب۔ نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیل جدید، لاہور۔ ۱۹۶۸ء۔ ص ۲۶

[2] محمد حسین، سید مودودی کے تعلیمی نظریات، لاہور ۱۹۷۶ء۔ ص ۴۷

۱- نباتیات | نباتیات کی طرف قرآن پاک نے مسلمانوں کی توجہ کچھ اس طرح مبذول کرائی -

سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ مِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ - (سورۂ یٰسٓ - آیت ۳۶)

۲- حیوانیات | وَالْخَیْلَ وَ الْبِغَالَ وَ الْحَمِیْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَ زِیْنَةً وَّ یَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ - (سورۃ النحل - آیت ۸)

۳- کیمیاء | اس علم کو پڑھاتے وقت بھی قرآن و حدیث کے حوالوں سے مدد لی جانی چاہیے - طلباء کو بتایا جانا چاہیے کہ اس علم کی ابتداء مسلمانوں ہی نے کی تھی - مسلمانوں ہی کی ایجادات پہ مغربی مفکرین نے اس علم کو آگے بڑھایا ہے - اس کے ساتھ ساتھ مسلم کیمیا دانوں کا تعارف بھی طلباء سے کرانا ضروری ہے - اس طرح طلباء جب عملی زندگی میں داخل ہو جائیں گے تو کیمیا دان ہونے کے باوجود اسلام کے داعی ہوں گے اور جہاں جائیں گے اپنے ملک کے نظریات کے محافظ ثابت ہوں گے -

۴- طبیعیات | آج کل طبیعیات پڑھاتے وقت سب سے پہلے پاکستانی طلباء کو یونانی کے سائنسدان ارشمیدس کا نام بتایا جاتا ہے اور اس کے تجربات سے روشناس کرایا جاتا ہے - اس طرح وہ اپنے بزرگوں سے واقف ہونے سے پہلے یورپ کے غیر مسلم مفکرین کے کارناموں سے متاثر ہو جاتے ہیں - نصابِ تعلیم کو اس طرح مرتب کیا جانا چاہیے کہ طلبا اپنے بزرگوں کے کارناموں سے واقف ہوں اور اُن کے نقشِ قدم پہ چلنے کی کوشش کریں -

معاشیات | معاشیات میں بھی سود کا حرام ہونا، اس کی معاشرتی بُرائیوں اور اس کے بُرے اثرات کو طلبا کے سامنے پیش کرنا چاہیے تاکہ اسلامیات اور معاشیات کی تعلیمات میں ہم آہنگی قائم قائم ہو اور طلباء کو اسلامی نظریات کے سمجھنے کا موقع ملے -

معاشرتی علوم | تاریخ مسلمانوں کا عظیم سرمایہ ہے - مسلمانوں نے اس کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے - قرآن بذاتِ خود ایک تاریخ اپنے اندر رکھتا ہے، جو انبیاء علیہم السلام کے حالات اور قوموں کی ترقی و ہلاکت کے واقعات پر مشتمل ہے - اسی طرح حدیث کا علم بھی علمِ تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے - تاریخِ اسلام کو دوسری تمام اقوام کی تاریخوں پہ فوقیت دینی چاہیے - کیونکہ

جو قوم اپنی تاریخ سے ناواقف ہوتی ہے وہ دوسروں پر بھروسہ کرتی ہے اور دنیا میں کوئی نمایاں کام انجام نہیں دے سکتی۔

شہریت کے باب میں تکمیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کی۔ لٹیرے جان و مال کے محافظ بن گئے۔ مہاجروانصار کا بھائی چارہ قائم کیا گیا۔ قرآن وحدیث میں حقوق و فرائض کی بڑی تاکید آئی ہے۔ قرآن وحدیث کے شہری اصولوں پر عمل کر کے انسان ایک بہترین شہری بن سکتا ہے۔

فلسفہ قرآن پاک بذاتِ خود ایک غیر متبدل فلسفے کی کتاب ہے جس میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے کہ زمین میں چل کر خدائی مخلوق میں غور و فکر کرو۔ اور اُس کو سمجھنے کی کوشش کرو تاکہ خالقِ کائنات پر ایمان پختہ اور یقین کامل ہو جائے۔

اِن حقائق کے علاوہ مسلمانوں میں کتنے عظیم مفکرین پیدا ہوئے جن کا ثانی دوسری اقوام یونان سے لے کر روس و امریکہ تک پیدا نہ کر سکیں۔ افلاطون، ارسطو، روسو اور یورپ کے دوسرے مفکرین کو اوّلیت دی جاتی ہے اور ان مفکرین کو جن کا تعلق ہمارے مذہب و ملک سے ہے، پیچھے رکھا جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو تاریخ سے غائب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے [۱]

درحقیقت سائنس کی تدوین و ترقی میں مسلمانوں کا اہم کردار ہے بلکہ انہوں نے جدید سائنس کی بنیاد رکھی۔ بہت اہم سائنسی انکشافات اور طبّی ایجادات ان کی مرہونِ منت ہیں۔ نصاب میں مسلمان موجدوں اور سائنسدانوں کے نام اور کارنامے ضرور شامل کرنے چاہییں۔ بجائے اس کے کہ سائنس کا موجد راجر بیکن کو قرار دیا جائے یا دوسرے علوم و فنون میں افلاطون، سقراط اور دوسرے بیرونی لوگوں کے کارنامے لکھے جائیں۔

مثلاً طلباء کو یہ پڑھایا جائے کہ ابن الہیثم نے دریائے نیل پر بند باندھنے کی تجویز پیش کی تھی۔ البیرونی نے مختلف دھاتوں، مثلاً سونا، چاندی، تانبا، لوہا، ٹین اور جست کا مخصوص وزن دریافت کیا۔

جابر بن حیان نے فنِ جراحی میں بے ہوش اور بے حس کرنے کے لیے مختلف دوائیں

---

[۱] مطبوعہ عزم نو ص ۵۵۱، ۵۶۰

ایجاد کیں۔

ابوالقاسم زہراوی نے سر، دانتوں، گردہ وغیرہ کے متعلق آپریشن کیے اور ان کی کتاب "التصریف" سرجری کا شاہکار ہے اور صدیوں تک یورپ کی طبی درس گاہوں میں شریک نصاب رہی۔

بوعلی سینا اولین معالج تھا جس نے علاج میں نفسیات کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ اس نے انکشاف کیا کہ انسان کے جذبات کا صحت و مرض سے گہرا تعلق ہے۔

رازی علم الامراض کا بڑا ماہر تھا۔ اس نے خسرہ اور چیچک میں امتیاز کیا۔ آنکھ کے آپریشن کا بڑا ماہر تھا۔

الزرقانی فلکیات کا بڑا ماہر تھا۔ کوپرنیکس سے پہلے الزرقانی اور نورالدین البطروجی نے زمین و کواکب کی حرکتِ محوری کو ثابت کیا۔

عمر خیام صاحبِ رباعیات، حقیقت میں منجم اور حساب دان تھا۔[1]

(باقی)

[1] حکیم آفتاب احمد قرشی، سائنس اور مسلمان - کراچی ص ۹ تا ۲۰

امام ولی الدین خطیب تبریزیؒ

جناب عبدالرشید عراقی صاحب

(۲)

۱۴۔ شرح مشکوٰۃ	مرتبہ شیخ عبدالعزیز کاہلی سندھی
۱۵۔ شرح مشکوٰۃ	مصنفہ شیخ محمد سعید فاروقی سرہندی بن احمد۔
۱۶۔ ذریعۃ النجاۃ شرح مشکوٰۃ	مصنفہ شیخ عبدالنبی شطاری گجراتی بن عبداللہ۔
۱۷۔ زینۃ النکات شرح مشکوٰۃ	مصنفہ سید محمد گجراتی بن جعفر الحسینی۔
۱۸۔ شرح مشکوٰۃ	مرتبہ شیخ طیب سندھی برہانپوری بن ابوالطیب۔
۱۹۔ شرح مشکوٰۃ بزبان فارسی	یہ شرح چار جلدوں میں ہے اور یہ شرح ۲ شوال ۹۹۳ھ کو

مکمل ہوئی۔ اس شرح میں درج ذیل خصوصیات ہیں:۔

۱۔ ضمائر کے مرجعوں کی وضاحت۔ ۲۔ کلمات محذوفہ کا اعادہ۔

۳۔ مبہم کی وضاحت۔ ۴۔ مقدر کی وضاحت۔

۵۔ تخصیص و تعمیم کی وضاحت۔ ۶۔ شرح کا متن سے ربط۔

۷۔ ترکیب نحوی۔ ۸۔ ہر باب و فصل کی احادیث کی تعداد کا تعین۔

۹۔ ہر کلمہ کے تعلقات کا بیان ۱۰۔ کلام غیر مکمل کی تکمیل۔

۱۱۔ زبان سہل فارسی ہے۔

۲۰- نجوم المشکوٰۃ شرح مشکوٰۃ (عربی) | مرتبہ شیخ محمد صدیق۔

۲۱- شرح مشکوٰۃ | مرتبہ شیخ محمد نعیم جون پوری بن محمد فائق۔

۲۲- طریق النجاۃ | مشکوٰۃ شریف کی احادیث کا ترجمہ مصنفہ مولانا محمد ابراہیم آروی (م ۱۳۲۰ھ) بن عبدالعلی [1]

۲۳- التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح | یہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی مرحوم کی تصنیف ہے، اور اس کی چار نامکمل جلدیں ۱۳۵۴ھ میں دمشق سے شائع ہوئیں [2]

۲۴- تنقیح الرواۃ فی تخریج احادیث المشکوٰۃ (عربی) | اس کا ابتدائی حصہ مولانا سید احمد حسن دہلوی (م ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۲۰ء) تلمیذ شیخ الکل حضرت مولانا سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی (م ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء) نے لکھا۔ اور کتاب الزکوٰۃ سے لے کر آخر تک مولانا ابوسعید شرف الدین محدث دہلوی (م ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۱ء) نے لکھا [3]

اس کی پہلی جلد مولانا حافظ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی مرحوم کی نگرانی میں دہلی سے شائع ہوئی۔ دوسری جلد کا مسودہ ڈپٹی صاحب مرحوم نے مطبع مجتبائی دہلی کو طباعت کے لیے دیا تھا کہ گم ہوگیا۔ مولانا ابوسعید شرف الدین کو اس کا سخت صدمہ ہوا۔

۱۹۵۸ء میں مطبع مجتبائی دہلی والوں کا سامان دہلی سے کراچی منتقل ہوا تو اس سامان میں یہ مسودہ بھی تھا۔ جماعت اہل حدیث کے ممتاز عالم اور محقق حضرت مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف مدیر الاعتصام لاہور کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپ نے صرف کثیر سے یہ مسودہ حاصل کیا۔ اس کا کچھ حصہ بوسیدہ اور کرم خوردہ تھا، جسے مولانا شرف الدین نے لکھا تھا۔ مولانا عطاء اللہ نے اس کو دوبارہ بڑی محنت اور جانفشانی سے ایڈٹ کیا۔ مولانا کا یہ علمی کارنامہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا اب اس کوشش میں ہیں کہ یہ علمی کتاب جلد از جلد زیور طباعت سے آراستہ ہو جائے۔

[1] اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں ص ۲۲۰

[2] تذکرۃ المحدثین جلد ۲ ص ۴۶۲

[3] تراجم علمائے حدیث ہند ج ۱ - ص ۱۸۲

۲۵ - مشکوٰۃ مع حاشیہ و تعلیق ۱۳۸۰ھ میں ابوبکر شادبس نے مشکوٰۃ کا متن کئی نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کر کے ناصر الدین البانی کے تحشیہ و تعلیقات کے ساتھ دمشق سے شائع کیا ہے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی لکھتے ہیں :-

" اس میں حدیثوں پر دو طرح کے نمبر دیے گئے ہیں، ایک تو کتاب کی مسلسل حدیثوں کے لحاظ سے اور دوسرے ابواب کی حدیثوں کی تعداد کو ظاہر کرنے کے لیے۔ حواشی میں حدیث کے غریب اور مشکل الفاظ اور وضاحت طلب امور کی تشریح کے علاوہ صاحب مشکوٰۃ کی مسامحتوں کا بھی ذکر ہے۔ مثلاً غلط حوالوں کی تصحیح کی گئی ہے اور جہاں سرے سے حوالے نہیں دیے گئے ہیں، وہاں حوالوں کی تخریج کی گئی ہے۔ جہاں ایک ہی حوالہ تحریر کیا گیا ہے وہاں مزید دوسرے حوالے بھی تحریر کئے گئے ہیں۔ بعض جگہ مشکوٰۃ میں دو حوالے دے کر الفاظ کو ان میں سے کسی ایک سے متعلق کیا گیا ہے۔ لیکن محشی نے اس کے بجائے دوسری کتاب کے الفاظ بتائے ہیں۔ بعض حدیثوں کو مشکوٰۃ میں مرفوع، متصل، اور مسند بتایا گیا ہے، لیکن حاشیہ میں اُن کے موقوف، منقطع اور مرسل ہونے کا ذکر ہے۔ اسی طرح اس میں جن کو موقوف وغیرہ کہا گیا ہے۔ اس میں اُن کے برعکس ہونے کی تصریح کی گئی ہے۔ اسی طرح مشکوٰۃ میں اگر امام ترمذی کی روایتیں نقل کر کے اُن کی تصحیح و تحسین یا تضعیف وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے تو اس میں یہ کمی پوری کر دی گئی ہے۔

جن حدیثوں کو مصنف نے نامکمل نقل کیا ہے، محشی نے اس کو مکمل نقل کر دیا ہے۔

جن حدیثوں کے بعض الفاظ اور ترجمے نقل ہونے سے رہ گئے ہیں، یا اُن میں کسی طرح کا تغیر ہو گیا ہے تو حاشیہ میں اُن کو اصل کے مطابق ٹھیک نقل کیا گیا ہے۔ اسی طرح جن حدیثوں کی سندیں ضعیف نقل ہوتی ہیں، اُن کے یا تو صحیح طرق بیان کیے گئے ہیں یا اُن کی تقویت کے لیے شواہد و متابعات بھی ذکر کر دیئے گئے ہیں"۔

یہ خوبصورت اور دیدہ زیب ایڈیشن ۳ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اور اس میں کئی فہرستیں بھی دی گئی ہیں۔ شروع میں امام بغوی (صاحب المصابیح) اور امام تبریزی (صاحب مشکوٰۃ المصابیح) کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں، اور دونوں کتابوں (مصابیح و مشکوٰۃ) پر مختصراً تبصرہ

بھی ہے [۱]

۲۶ - زجاجۃ المصابیح | یہ مولانا سید ابوالحسنات عبداللہ شاہ حیدر آبادی کی تصنیف ہے۔ اس کو مشکوٰۃ ہی کی طرز پر فقہی ابواب کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے۔ اور عموماً کتب وابواب بھی اس سے لیے گئے ہیں۔ البتہ مشکوٰۃ میں جہاں عنوانات میں شافعی مسلک کی رعایت کی گئی ہے وہاں اس میں فقہ حنفی کی رعایت مد نظر رکھی گئی ہے۔ ساتھ ہی حواشی میں حدیثوں کی مختصر تشریح بھی کی گئی ہے۔ یہ کتاب عربی میں ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے [۲]۔

۲۷ - شرح مشکوٰۃ (عربی) | استاذ العلماء حضرت العلام مولانا حافظ محمد گوندلوی مدظلہ العالی سابق امیر جمعیۃ اہل حدیث۔

آپ نے مشکوٰۃ کی شرح لکھنی شروع کی مگر کتاب العلم تک ہی لکھ سکے کہ اس کے بعد یہ سلسلہ رُک گیا۔

۲۸ - مرعاۃ المفاتیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح | یہ شرح جمعیۃ اہل حدیث ہند کے ممتاز عالم و محدث مولانا ابوالحسن عبید اللہ رحمانی مبارک پوری مدظلہ العالی کی تصنیف ہے۔ مولانا عبید اللہ رحمانی مشہور اہل حدیث عالم مولانا عبدالسلام مبارک پوری (م ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۴ء) صاحب سیرۃ البخاری کے صاحبزادے ہیں۔ محرم ۱۳۲۲ھ میں مبارک پور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عربی و فارسی کی کتابیں اپنے والد ماجد مولانا عبدالسلام سے پڑھیں۔ ان کے علاوہ آپ کے اساتذہ میں مولانا غلام یحییٰ کانپوری، مولانا احمد اللہ امرتسری، مولانا حافظ عبدالرحمٰن اور مولانا عبدالعلی عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری صاحب تحفۃ الاحوذی فی شرح جامع الترمذی (م ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۵ء) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

تکمیل تعلیم کے بعد شیخ عطاء الرحمٰن کے مدرسہ رحمانیہ دہلی میں مدرس مقرر ہوئے۔ انہی دنوں مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری صاحب تحفۃ الاحوذی مکفوف البصر ہو گئے تھے۔ اور آپ کی اپنی شرح

---

[۱] تذکرۃ المحدثین جلد ۲ ص ۲۶۳

[۲] ایضاً ص ۲۶۴

تحفۃ الاحوذی کی تکمیل کے سلسلہ میں ایک ایسے لائق عالم و فاضل کی اعانت کی ضرورت تھی، جو فنونِ حدیث سے خاص مناسبت اور ادب سے ذوق رکھتا ہو۔ چنانچہ مولانا عبدالرحمٰن مرحوم کی نظر آپ پر پڑی۔ شیخ عطاء الرحمٰن صاحب مہتمم مدرسہ رحمانیہ نے آپ کو مبارک پور بھیج دیا اور آپ کی ملازمت کو بحال رکھا۔ چنانچہ آپ نے دو سال مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے سامنے بطور معاون رہ کر تحفۃ الاحوذی کی آخری دو جلدوں کی تکمیل کی لے

مرعاۃ المفاتیح کی اب تک ۳ جلدیں شائع ہوئی ہیں، جس میں دو جلدیں مبارک پور سے شائع ہوئی ہیں اور ایک جلد المکتبۃ السلفیہ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی لکھتے ہیں۔

"اس شرح میں پہلے کی اکثر شرحوں کا خلاصہ آگیا ہے۔ لائق شارح نے حدیثوں کی مفصل تشریح کر کے ان کے معانی و مطالب کی پوری وضاحت کی ہے۔ اس ضمن میں محدثین پر طعن و تشنیع کرنے، منکرینِ حدیث اور حدیثوں سے غلط نتائج مستنبط کرنے والوں کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ اور اُن کے تناقض و تضاد کو بھی رفع کیا گیا ہے۔ فقہی اختلاف نقل کرنے اور ائمہ فقہ و اجتہاد کے مذاہب و دلائل بیان کر کے مرجح و قوی مسلک کی تعیین کی گئی ہے۔ شارح نے عموماً محدثین کے مذہب کی تصویب کی ہے، اور مرجوح اقوال پر بعض جگہ رد و کد بھی کی ہے۔ حدیثوں کی مشکلات اور لغوی و نحوی مسائل کو حل کرنے پر خاص دھیان دیا گیا ہے۔ ان پر نقد و بحث کر کے ان کے درجہ و مرتبہ اور قوت و ضعف کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ رواۃ کے مختصر ترجمے اور بلاد و اماکن کے متعلق ضروری معلومات تحریر کئے گئے ہیں۔ مشکوٰۃ کی پہلی اور تیسری فصل میں صحیحین کی جو حدیثیں نقل کی گئی ہیں، اگر اُن کی تخریج دوسرے محدثین نے بھی کی ہے تو اُس کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسری حدیثوں کی فصل کے لیے جو حوالے دیے گئے ہیں، اگر اُن کی تخریج ان کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی کی ہے، تو

لے تراجم علمائے حدیث ہند جلد اوّل ص ۴۰۷

ان کی تصریح کر دی گئی ہے۔ جہاں مصنف نے حوالے تحریر نہیں کئے ہیں وہاں حوالوں کی تخریج کی گئی ہے۔ اگر مصنف سے الفاظ حدیث نقل کرنے میں کوئی مسامحت ہوئی ہے تو اس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ یا اگر انہوں نے صحیحین کی جو حدیثیں پہلی فصل کے بجائے دوسری فصل میں اور دوسرے محدثین کی حدیثیں دوسری کے بجائے پہلی فصل میں بیان کی ہیں تو ان پر تنبیہ کی گئی ہے اور جن حدیثوں کو مصنف نے مختصر نقل کیا ہے، ان کا پورا متن اس میں نقل کر دیا گیا ہے۔ مسلسل حدیثوں پر نمبر دیے گئے ہیں۔ ابواب کی حدیثوں میں علیحدہ نمبر بھی لگے ہیں۔ شروع میں کئی مفصل فہرستیں اور ایک مقدمہ ہے۔ اس میں اصول حدیث پر عالمانہ گفتگو کی ہے [۱]

۲۹۔ مظاہر حق | یہ اردو میں مشکوٰۃ کا ترجمہ اور اس کی شرح ہے۔ ترجمہ کی ابتداء شاہ محمد اسحاق دہلوی (م ۱۲۶۲ھ) نے کی [۲] مگر پھر ان کے ایماء اور مشورہ مولانا قطب الدین خان دہلوی (م ۱۲۸۹ھ) نے اس کو شرح کی شکل دی۔ اردو میں ہونے کی وجہ سے اس شرح سے عوام کو بڑا فیض پہنچا [۳]

یہ شرح کئی بار چھپ چکی ہے۔ مطبع نول کشور سے بھی شائع ہوئی۔ اور اب لاہور سے شیخ غلام علی اینڈ سنز نے بھی شائع کی ہے۔

مظاہر حق کی زبان و طرز بیان کی قدامت کی بنا پر دار العلوم دیوبند کے بعض فضلا نے اس کو موجودہ دور کی سہل اور سلیس زبان میں معارفِ مشکوٰۃ کے نام سے شائع کیا ہے۔ پہلی جلد ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ شروع میں اصول حدیث کے مسائل و مباحث پر ایک مقدمہ بھی ہے [۴]

۳۰۔ ترجمہ مشکوٰۃ المصابیح اردو | از مولانا حافظ محمد ابو الحسن مرحوم سیالکوٹی [۵]

۳۱۔ انوار المصابیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح (اردو) | از مولانا عبد السلام بستوی (م ۱۳۹۴ھ) [۶]

---

[۱] تذکرۃ المحدثین ج ۲۔ ص ۴۶۴ [۲] ایضاً ص ۴۶۲ [۳] ایضاً ص ۴۶۲ [۴] ایضاً

[۵] ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات :

[۶] اسلامی خطبات ص ۲

۳۲ - ترجمہ مشکوٰۃ المصابیح (اُردو) | از مولانا عبدالاول غزنوی (م ۱۳۱۳ھ) یہ مشکوٰۃ شریف کا بین السطور ترجمہ ہے - اور اس کے ساتھ مختصر حاشیہ ہے - چار جلدوں میں ہے - سب سے پہلے یہ کتاب امرتسر سے طبع ہوئی - اب دوبارہ جامعہ اثریہ سانگلہ ہل سے طبع ہوئی ہے -

۳۳ - ترجمہ اُردو مشکوٰۃ المصابیح | از مولانا محمد اسماعیل السلفی سابق امیر جمعیۃ اہل حدیث پاکستان (م ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۹۶۸ء) - پہلی جلد مولانا محمد اسماعیل کے قلم سے ہے - اور باقی ۳ جلدوں کا ترجمہ مولانا سلیمان کیلانی نے کیا ہے -

چاروں جلدیں مطبوعہ ہیں -

طیارے کا اغوا ـــــــ لمحۂ فکریہ

نعیم صدیقی صاحب

پاکستانی طیارے کے اغوا کا خوفناک ڈرامہ ایک جواں سال اور ذی حیثیت شہری کی جان لے کر بالآخر ختم ہوا۔ سنّو سے زیادہ نجات یافتہ "یرغمالیوں کو مبارک باد" اور صدر ضیاء الحق اور ان کے معاونین اور مشیروں نے مل کر جو بھاری سفارتی معرکہ لڑا اُس پر "اَحْسَنْتُمْ"۔
بہرحال پاکستان کو اس کے تین فضائی قزاقوں نے ہائی جیکنگ کی تاریخ کا طویل ترین باب بنا دیا ہے۔

ہمارے مطالعہ و تفکر کے مطابق جو کچھ ہوا، اچانک نہیں ہوا کہ نہ اس کے پیچھے کچھ عوامل ہوں، اور نہ آگے کچھ مراحل۔ یہ تو ایک طویل زنجیر کا ایک بڑا حلقہ ہے۔ جس کے ساتھ پیچھے کی تمام کڑیاں بھی آگے جڑتی ہیں اور آگے کی کڑیاں بھی مربوط ہیں۔ اب چھپا کیا رہا ہے کہ واشگاف بات کہنے میں کسی کو کوئی تامل ہو۔ یا اس کی اشاعت میں کسی کو احتیاط محسوس ہو۔ پاکستان پیپلز پارٹی، کابل، شام اور لیبیا (جو بظاہر اس واقعہ سے کنارہ کر گیا ہے[1]) ایک ایسا سرخ دائرہ بناتے ہیں جس کا مرکز و محور روس ہے،

---

[1] مگر یہ امر کچھ زیادہ مخفی نہیں رہا کہ لیبیا میں پیپلز پارٹی کے بھگوڑے لیڈروں اور کارکنوں کا ٹھکانا ہے۔ وہاں سے اس گروہ کے لوگوں کو مالی امداد ملتی ہے۔ نیز چھاپہ ماروں کی تربیت کا انتظام بھی موجود ہے مگر اغوا شدہ طیارے کے کابل جانے، وہاں قزاقوں سے سرکاری مہمانوں کا سلوک ہونے، انہیں اسلحہ جہاز میں فراہم کئے جانے، مرتضیٰ بھٹو کے موقع پہ بہ حیثیت سرغنہ نمودار ہونے اور روس اور کابل کے لئے قزاقِ اعلیٰ کے تعریفی بیانات سامنے آنے کی وجہ سے لیبیا نے عین آخر وقت پہ "تقویٰ" اختیار کر لیا حالانکہ دنیا بھر کے قزاقوں کے لئے لیبیا رضاکارانہ اسپرٹ سے باقاعدہ اعلان کر کے پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔

ہمیں یہ کہنے میں کوئی چیز حائل نہیں محسوس ہوتی کہ فضائی قزاقی کا متذکرہ ہولناک حادثہ نہ صرف یہ کہ روسی نفوذ کی ایک علامت ہے۔ بلکہ اس سے مقصود پاکستان میں روسی نفوذ کو توسیع و استحکام دینا بھی ہے۔

کون سیاست آشنا فرد آتنا بے خبر ہوگا جسے یہ معلوم نہ ہو کہ ہمارے ہاں بیرونی روپیہ، اسلحہ اور لٹریچر تقسیم ہوتا رہا ہے اور کچھ عرصے سے یہ "بارانِ رحمت" بہت بڑھ گئی ہے۔ خاص طور پر افغانستان میں کھلے کھلے کمیونسٹ راج کے قائم ہونے اور اس کے خلاف افغانی عوام کے جہاد برپا کرنے اور پاکستان میں قافلہ در قافلہ لاکھوں مہاجرین کے آمد کے ساتھ عنایاتِ خفیہ بہت بے پایاں ہوگئی ہیں روسی سفارتخانے میں دانشوروں اور نوجوان طلبہ اور تنظیم کار لیڈروں کی ضیافتوں اور خصوصی ملاقاتوں اور پس پردہ گفتگوؤں کا سلسلہ زوروں پر رہا ہے۔ پیپلز فیڈریشن اور نیشنل فیڈریشن کے طلبہ نے ادھر ہی کی سرپرستی اور امداد سے انتخابی معرکے لڑے، متعدد بار ہنگامہ آرائی کی اور محب اسلام و پاکستان طلبہ میں سے ایک سے زیادہ کو قتل کیا۔ اور بیسیوں کو جگہ جگہ مارا پیٹا اور ایسے اکثر واقعات بائیں بازو کے طلبہ کے ساتھ غیر طالبعلم غنڈہ عناصر مجرمانہ کارروائیوں میں شامل ہوتے رہے۔ صحافیوں اور اساتذہ اور وکلاء میں بھی حامیان روس کے حلقے پیدا ہو کر نشوونما پانے لگے۔ روس سے شائع شدہ مخالفِ اسلام و معاندِ پاکستان لٹریچر مختلف مصنفین اور ناشروں کے ناموں سے یہاں پھیلتا رہا، نیز یہاں کے پریسوں سے پرنٹ لائن کے بغیر کئی پمفلٹ اور ہینڈ بل چھاپ کر یا سائیکلو اسٹائل مشینوں پر تیار کر کے پھیلائے جاتے رہے۔

ادھر کراچی کے پاس روسی امداد سے قائم شدہ سٹیل مل کے ذریعے الگ سے کام کیا جاتا رہا اور آج بھی ہو رہا ہے۔ اس کا بین ثبوت تو یوں سامنے آگیا ہے کہ فضائی قزاقوں میں سے ایک یعنی ارشد علی، اسٹیل مل میں رہ چکا ہے۔ نمائندہ نوائے وقت کے الفاظ میں "اسٹیل ملز کے ذرائع نے آج یہاں بتایا کہ ارشد علی خاں کا اس ٹولے سے گہرا تعلق تھا جو اسٹیل ملز میں خلاف قانون سرگرمیوں میں ملوث رہا۔ ارشد علی اور اس کے ساتھیوں کے خلاف دفعہ ۳۰۷ کے تحت مقدمات درج کئے گئے" مگر دوسری طرف یہ ہوا کہ "سٹیل ملز کے بعض افسروں کی طرف سے ملزموں کی مبینہ پشت پناہی کی گئی۔"

واضح رہے کہ اخباری اطلاع کے مطابق یہ لوگ اسٹیل ملز میں آتشزنی کا ارتکاب کر کے کئی شعبوں کو نقصان پہنچا چکے ہیں۔

اس سے پہلے اخبارات میں مجمل طور پر یہ حقائق آ چکے ہیں کہ فولادی کارخانہ چلانے کے لیے جن نوجوان انجینئروں اور دیگر کارخانوں کو خصوصی تربیت کے لیے روس لے جایا جاتا رہا ہے۔ ان کو وہاں الحاد سکھانے، اشتراکیت پر ایمان لانے اور اشتراکی انقلاب برپا کرنے اور اس غرض کے لئے وطن میں تخریبی کارروائیاں کرنے کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ نوجوان عنصر کو جس کا اسلامی شعور اور کردار بھی پختہ نہ ہو، اگر کسی ملحدانہ و مادہ پرستانہ جبری معاشرے کے ماحول میں دنیا اور وطن سے الگ تھلگ رکھا جائے اور مال اور جنس اور شراب کا دباؤ اس پر بڑھا دیا جائے تو اس کی دماغی تطہیر (BRAIN WASHING) کس درجے کی ہو گی۔ ملحدانہ اشتراکی تعلیم کے علاوہ اسے پڑھنے کے لئے جو اخبارات، دیکھنے کے لئے جو مناظر اور تصویریں اور ٹیلی ویژن اور سننے کے لئے جو ریڈیو مقدر ہوں گے اُن سب کی قوت اسے ایک ہی معین سمت میں دھکیلے گی۔ وہاں کوئی اسلامی لٹریچر نہیں، ادارے نہیں، آباد مساجد نہیں، اپنے طرز کی دینی اور قومی تقریبیں نہیں، ملاقات کے لئے شخصیتیں نہیں۔ مخالف اسلام دعووں کے جواب میں دلائل دینے والا کوئی نہیں۔ مجلسیں اور ملاقاتیں بھی تمام اشتراکی فضا رکھنے والی، اور گفتگوئیں بھی سراسر اشتراکی خطوط پر! پھر روس میں جا کر تعلیم و تربیت پانے والوں کو نہ صرف یہ خیال کہ اپنے اساتذہ اور ممتحنوں کو مطمئن کر کے پاس ہونا ہے بلکہ بعد میں بھی اسٹیل ملز کے روسی افسروں ہی کے فیضانِ نظر سے قرب اور ترقی کے مواقع سے فائدہ اٹھانا ہے۔ اِدھر خود اسٹیل ملز پر روسی امداد سایہ افگن ہے اور روسی افسران اس چھوٹی سی اقتصادی و صنعتی ریاست کی قیادت اور چودھراہٹ پر قابض ہیں۔ یہاں بھی سلسلۂ تربیت قائم ہے اور دماغی تطہیر کا عمل جاری ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہماری حکومت کا نظامِ نگرانی وہاں کس حد تک کام کرتا ہے اور ہماری انتظامی مشینری رفتارِ احوال پر کتنا قابو رکھتی ہے۔ بہرحال یہ امر بالکل واضح ہے کہ اب ہماری سیاسی تاریخ جیسی کچھ بھی بنے گی اس میں اسٹیل ملز کا مؤثر دخل ہے گا۔

پچھلے دنوں ہلٹن ہوٹل میں فیض احمد فیض کی جو سترویں سالگرہ منائی تھی اسے ہمارے ہاں بالعموم

ایک عام سی مجلس سمجھا گیا ہے ۔ حالانکہ یہ ایک علامتی اقدام تھا۔ اس پردے میں روس کو بھی اور پاکستان کے اندر بکھرے ہوئے کمیونسٹ اور نیم کمیونسٹ عناصر کو بھی سرخ جھنڈی ہلا کر اشارہ دے دیا گیا تھا کہ ہمارا کارروان جادہ پیما ہو رہا ہے اور لائن کلیئر ہے ۔ اس کارروان کا پیش آہنگ پیپلز پارٹی ہے ۔ کمیونسٹوں کے سامنے عرصہ سے یہ گائیڈ لائن ہے کہ وہ جہاں کمزور ہوں خود اگلی صف بنا کر کوئی معرکہ آرائی نہ کریں ، بلکہ ہر ملک کی کسی ایسی مقامی پارٹی کو کاربرآری کے لئے چن لیں جو نظریاتی لحاظ سے ان کے کسی قدر قریب ہو حتیٰ کہ اگر محض کوئی سیکولرسٹ جتھا ایسا مل جائے جو تخریب کاری اور جبر و تشدد کے طریقوں سے کام لے کر ماحول کو تعمیری مقاصد کے لئے تباہ کر سکتا ہو تو اس کے لئے زندہ باد کہہ دیا جائے ۔ ہمارے ہاں کے کمیونسٹوں کا نصیبہ جاگا تو پیپلز پارٹی وجود میں آئی ۔ اول تو پارٹی کا نام کمیونسٹوں کی علامتی اصطلاح اپنے اندر رکھتا تھا۔ پھر جب پارٹی کا تثلیثی کلمہ وجود میں آیا تو اس کا ایک جزو یہ تھا کہ " سوشلزم ہماری معیشت " ہے ۔ اس کی تشریح میں " روٹی ، کپڑا ، مکان " کا نعرہ نمودار ہوا۔ یوں گویا کمیونسٹوں کے لئے امید کا ایک بڑا دروازہ کھل گیا ۔ پھر پارٹی نے اپنے دورِ عروج میں فسطائیت کی راہ اختیار کی ، غنڈوں کی سرپرستی کی ، مزدوروں اور کسانوں اور چھوٹے ملازموں کو نظام معاشرہ کے خلاف متحرک کر دیا ۔ طرح طرح کے تصادم پیدا کئے ۔ مخالفین کو قتل کرایا ۔ اور سینکڑوں کو عقوبت خانوں کے حوالے کیا ۔ جس سے جو چاہا چھین لیا ——— وہ عہدہ ہو یا زمین یا عمارت یا کارخانہ ——— اور جسے جو چاہا دے دیا ۔ جس قانون کے خلاف جو فیصلہ پسند آیا نافذ کر دیا ۔ پیپلز پارٹی کے اس سیاسی کردار نے تو ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ جیسے پانچوں انگلیاں گھی میں ہوں ۔ اور سر کڑاہی میں ۔ اپنے لوگوں کو جا بجا انہوں نے اندر داخل کر دیا ۔ اور نمایاں قسم کے انتہا پسند انقلابی باہر بیٹھ کر " سگنلنگ " کرتے رہے (یعنی اشارے دیتے رہے) ۔ اندر اور باہر کے کمیونسٹ اسٹیج اور اخبارات اور مفلٹوں اور ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ذریعے پیپلز پارٹی کے سیکولر مادہ پرستانہ ، سوشلزمی اور فسطائی کردار کا تحفظ کرنے اور دوسری جانب کی مخالف جماعتوں کے خلاف محاذ آرائی میں لگے رہے ۔ حتیٰ کہ شعر و ادب جیسے لطیف پیرایوں میں بھی انہوں نے زہر چکانی کی ۔ ان کی سرد جنگ ۱۹۷۷ء کے بعد نہ صرف مارشل لا حکومت کے خلاف جاری رہی ، بلکہ محب وطن جماعتوں کے خلاف اور خود اسلام کے خلاف

انہوں نے لمحہ بہ لمحہ دار کیے ہیں۔
نوبت بایں جا رسید کہ کمیونسٹوں کی فرنٹ لائن کی حیثیت سے کالعدم پیپلز پارٹی جس کی قیادت بیگم نصرت بھٹو اور متعلقہ خاندان میں مرتکز ہے، ہائی جیکنگ جیسی غدارانہ کارروائی کی محرک بنی۔

اس وقت روس اور کارمل حکومت کو درد سر یہ درپیش ہے کہ پاکستان کے خواص و عوام جن میں موجودہ حکومت کی ساخت یا اس کے بعض اقدامات اور طریق کار سے اختلاف رکھنے والے عناصر بھی موجود ہیں، وہ آخر ایسی کارروائیاں کرتے کیوں نہیں کہ ایک طرف تو خود حکومت پاکستان کی توجہ مسئلہ افغانستان اور مہاجرین افغانستان سے ہٹ کر اپنے اندرونی احوال پر مرتکز ہو جائے، اور دوسری طرف دنیا کے لیے بھی پاکستان ایک نیا موضوع فراہم کر کے اقوام عالم کی توجہات کو افغانستان سے ہٹائے اور روس کے خلاف بہنے والا عالمی پروپیگنڈے کا دھارا کچھ کمزور پڑے۔
پہلے دن سے پاکستان نے افغانستان پر مصنوعی کمیونسٹ حکومتوں کے ٹھونسے جانے کے خلاف اپنا موقف لیا ہے۔ لیکن کارمل کے دور کے ساتھ ساتھ قریباً ایک لاکھ روسی فوج کے افغانستان میں بل پڑنے کے خلاف جب سے اقوام متحدہ، اسلامی کانفرنس اور تیسرا بلاک کہلانے والے غیر جانبدار ممالک کے اسٹیج سے زوردار آواز بلند ہوئی ہے، روس کا پیچ و تاب بڑھ گیا ہے اور ببرک کارمل کی حکومت بھی بہت جھنجھلائی ہوئی ہے۔
اس زمانے میں ادھر سے سارا زور اس پر صرف کیا جا رہا ہے کہ کسی طرح پاکستان میں کوئی بڑا ہنگامہ کھڑا کیا جا سکے۔ ورنہ روس کی عالمی حیثیت کو جتنا شدید نقصان پہنچ رہا ہے، وہ اس کے لیے اضطراب انگیز ہے۔ تخریب اور شورش انگیزی کا کھیل رچانے کے لیے روسی ہدایت کاروں کو اب تک بیوہ نصرت بھٹو سے زیادہ بہتر نہ کوئی ہیروئن ملا، نہ ہیروئن۔ چنانچہ بیگم صاحبہ نے متعدد موقعوں پر قانون اور حکومت کے خلاف متحرک ہو کر کوئی طوفان اٹھانا چاہا، مگر فلیتہ تو ہر بار جلا، بارود بھک سے نہیں اڑ سکا۔
لیکن تیاری ساتھ کے ساتھ جاری رہی اور نقشہ ایک بین الاقوامی تحریک کا اختیار کیا گیا۔ ایک

اڈا لندن بنا، دوسرا لیبیا، تیسرا کابل اور چوتھا رنوڈیرو، جو مرکز تھا - باہر کے مرکزوں نے ایک تو پروپیگنڈا کی قوت کو استعمال کیا، مالی مصارف کا انتظام کیا۔ کارکنوں کو چھاپہ مار ٹریننگ دلوائی۔ اور روس سے منصوبہ بندی میں رہنمائی لی - دوسری طرف اندرونِ ملک مختلف قسم کے کام کیے گئے۔ بلوچستان میں کسی قدر کم، اور سندھ میں زیادہ زور دیا گیا پیپلز پارٹی اور بھٹو ازم کے حق میں اور موجودہ حکومت اور اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کے انتظامات کیے گئے - بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ سندھ کے اندرونی حصوں میں کیا ہو رہا ہے اور کیا کیا چیزیں چھپ کر تقسیم ہو رہی ہیں - ادب کو کس رنگ میں رنگا جا رہا ہے اور طلبہ کے ذہن کیسے بنائے جا رہے ہیں - اور جرائم پیشہ غنڈوں کو کس طرح استعمال کیا جا رہا ہے - اور کوئی نہیں جانتا کہ اب تک اس طوفان کی لہروں کا مقابلہ کرنے کے لیے محض "حبسِ دم" کا طریقہ کیوں اپنایا گیا ہے -

دوسرا بڑا کام "پیپلی" بہادروں نے یہ کیا کہ ملک میں بموں کے دھماکوں سے لے کر بینک لوٹنے تک کی بہت سی ایسی تخریبی کارروائیاں کیں، جن سے ایک طرف قوم کو بہت مالی نقصان پہنچا — دوسری طرف لوگوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا اور تیسری طرف تخریب کاروں نے تجربہ کی منازل طے کر لیں -

خاص طور پر پچھلے دنوں بنک ڈکیتیوں کی جو کارروائیاں پے در پے ہوئیں اور جن میں طریقِ واردات کی یکسانی کام کرتی ہے اور یکسانی یہ بھی ہے کہ مجرم بھاگنے میں کامیاب ہوتے اور پکڑے نہیں جا سکے۔ ان کے بارے میں آسانی سے یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی منصوبے کے تحت ہوتا رہا ہے — اِس سے مزید تخریبی کاموں کے لیے مجرمین نے سرمایہ بھی حاصل کیا۔

تیسرا محاذ جو شروع ہونے سے پہلے ہی درہم برہم ہو گیا۔ سات پارٹیوں (جو پہلے نو تھیں) کے اس نام نہاد اتحاد کی شکل میں سامنے آیا، جسے عرفاً ایم آر ڈی کہا جاتا ہے[1] ۔ اس نام نہاد کے دھندلے سے ڈھانچے کا نقیب "بی بی سی" بنا - ماہرانہ سروں نے اس غبارے میں زور زور سے پھونکوں سے ہوا

---

[1] ایک لطیفہ ایم، آر، ڈی کو اگر اردو حروف میں بدلا جائے تو وہ ہوں گے "م ر د"۔ حامی تو ان حروف سے لفظ بنائیں گے: مَرد - مگر واقعاتی لحاظ سے اب یہ کہنا صحیح ہوگا: "مُرد"۔

بھرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی - مگر یہ پوری طرح پھولنے سے پہلے ہی پھٹ گیا - اوّل تو اس اتحاد میں پارٹیاں کم تھیں اور "رہبر" زیادہ - پھر شروع ہی میں دو کی علیحدگی ہوگئی - بقیہ کے بارے میں یہ چرچا تھا کہ دستخط کرنے والے دوا ور لیڈر مغالطے میں رہے ہیں - اور وہ شاید چل نہ سکیں گے - اب تو خبر ساری تعبیر میں مضمر خرابی ایک ڈائنا مائیٹ بن گئی ہے اور ملبہ بکھر رہا ہے -

بیگم صاحبہ نے اس کھیل کا آغاز کرتے ہوئے جو باتیں کہی تھیں اگر اُن کے ساتھ بیٹھنے والے لوگ سمجھدار ہوتے تو اسی وقت اُن کے تیور پہچان لیتے - وہ ایک طرف تو سیاسی انتقام کا نعرہ بلند کر کے ایک منفی تخریبی سیاست کا راگ الاپ رہی تھیں - دوسری طرف مخالفین کو دھمکیاں دینے کے علاوہ موجودہ حکومت کو اس طرح چیلنج کر رہی تھیں جیسے اُن کے ہاتھوں میں بھرا ہوا پستول ہے اور وہ پورے پاکستان اور اُس کے اقتدار کو ایک طیارے کی طرح اغوا کر کے لے جائیں گی - اُن کی اسکیم یہ تھی کہ ادھر ایم - آر - ڈی سڑکوں پر نکل کر توڑ پھوڑ شروع کرے گی - ہر طرف ہڑتالوں کا دور دورہ ہوگا - ہر طبقے اور شعبے کے لوگ چاروں طرف سے حکومت کے خلاف اُمڈ پڑیں گے تو کسی شدید طوفانی لمحے میں یکایک پی - آئی - اے کے طیارے کا اغوا مُلک کے سربراہوں کو بوکھلا دے گا - تب وہ موقع پیدا ہوگا کہ وہ کبر و نخوت کے گھوڑے پر سوار ہو کر قبضۂ اقتدار کی طرف بڑھیں گی - اور سات پارٹیاں اُن کی رکاب تھامے ہوئے ہوں گی - واقعی لاجواب خواب تھا - مگر خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا -

آپ سوال کر سکتے ہیں کہ یہ شبہ کرنے کے کیا وجوہ ہیں کہ بیگم صاحبہ اور اُن کی کالعدم پیپلز پارٹی کا کوئی تعلق طیارے کے اغوا سے تھا - بات یہ ہے کہ یہ اغوا جس طرح واقع ہوا ہے، جن لوگوں نے یہ جرم کیا ہے، پھر کابل میں جو صورتِ حال پیش آئی ہے سامنے جن مجرموں کو رہا کرانے کی فہرست قزاقوں نے پیش کی ہے - الذوالفقار نامی خفیہ تنظیم کے جو کارنامے فخریہ انداز سے قزاق لیڈر نے پیش کیے ہیں - اور پھر جس طرح مرتضیٰ بھٹو صاحب متذکرہ تنظیم کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے "موقع" پر اپنے کارندوں کے کمال کا ملاحظہ کرنے پہنچے ہیں، یہ ساری چیزیں واقعات کی ڈوریاں بیگم صاحبہ کے دماغ سے جوڑ دیتی ہیں - اگر بات یوں نہیں تو بیگم صاحبہ یہی فرمائیں کہ انہوں نے مرتضیٰ بھٹو سے علیحدگی و بیزاری کا کوئی اعلان پہلے کبھی کیا؟ کبھی اس کے چھاپہ مار منصوبوں کے لیے اپنی ناپسندیدگی کا اعلان کیا؟ چلیے یہ بھی نہ سہی - واقعہ ہو جانے پر جو بیان انہوں نے دیا، کیا اس میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جو اُن کو قزاقی

کے واقعہ سے الگ کر دے ۔ اس بیان کا انداز دوسرا ہے ۔ اس میں تو یہ کہا گیا تھا کہ اس واقعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کے حالات کتنے خراب ہیں ۔ اور صدر ضیاء الحق کو بڑی تحدی سے کہا گیا تھا کہ وہ نوشتۂ دیوار پڑھیں ۔ کیا اس بیان میں انہوں نے قزاقوں کے فعل کے خلاف نفرین کی ؟ کیا انہوں نے ملک و قوم کے لیے ہمدردی کا کوئی کلمہ کہا ؟ کیا انہوں نے مصیبت میں مبتلا ہونے والے یرغمالیوں کی حالت پر اظہارِ رحم فرمایا ؟

آج سارا کھیل بگڑ جانے کے بعد اگر بیگم صاحبہ حادثے سے اپنی اور کالعدم پیپلز پارٹی کی بے تعلقی کا دعویٰ کرتی ہیں تو وہ بے معنی ہے ۔

فضائی قزاقی کے اس حادثے نے جو سوال کھڑے کر دیے ہیں ، اُن میں سے ایک بڑا سوال یہ ہے کہ کالعدم پیپلز پارٹی اور اس کے اکابر اور کارندوں کو اتنے بڑے جرم کا موقع کیوں ملا ؟

یہ موقع اس لیے ملا کہ ایک غلط کار قوت کو ، جس نے ملک تڑوایا ، جس نے ہر دفتر اور کارخانے اور ادارے کو کام لینے والوں اور کام کرنے والوں کا اکھاڑہ بنا دیا ، جس نے اختلاف کرنے والوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا ، جس نے جرائم پسند طبقوں کے لوگوں کو سیاسی محاذ پر لا کھڑا کیا ، جس نے اپنے مخالفین کو عہدوں اور ملازمتوں سے ہٹا کر اپنے آدمیوں کو اُن کی جگہ بٹھایا ، جس نے تھانوں اور دفتروں پر پارٹی ورکروں کو اجارہ داری دلوائی ، جس نے سرکاری خزانے اور بنکوں کے سرمایے سے اپنے لوگوں کو روپیہ دلوایا اور راشن ڈپو اور سیمنٹ کی ایجنسیاں بخشیں ، جس نے اخلاقی قدروں کو تہ و بالا کر دیا ، جس نے انتخابات کے دوران میں جمہوریت کو تہس نہس کر دیا ۔ اُس کا زور توڑنے کے لیے آخر ضروری اور جائز حد تک بھی تدابیر کیوں نہیں کی گئیں ۔

ضروری تھا کہ قرطاس ابیض میں شائع شدہ بدعنوانیوں کی تحقیق کی جاتی اور مغصوبہ اموال و املاک کو ضبط کیا جاتا اور سزائیں دی جاتیں ۔ ضلع وار کمیشن بٹھا کر نئی شکایات کی تحقیق کی جاتی ۔ جن لوگوں کو پارٹی کے دورِ اقتدار میں اہم جگہوں پر بٹھایا گیا تھا ، اُن کی نشاندہی ہوتی ، خصوصاً نظامِ تعلیم اور ذرائع ابلاغ کی تطہیر اوّلیت رکھتی تھی ۔ پارٹی کے لیڈروں اور معروف

کارکنوں پر پابندی لگائی جاتی کہ وہ سیاسیات اور انتخاب میں ایک عرصے تک شرکت نہیں کر سکتے۔ نئی بھرتی پر پابندی لگا دی جاتی ۔ راشن ڈپوؤں ، پٹرول پمپوں اور سمینٹ ایجنسیوں اور دوسرے نیم سرکاری ادارہ ہائے مفاد سے اُن کو الگ کیا جاتا ۔ طیارے کے اغوا کے بعد اب یہ بھی ضروری ہوگیا ہے کہ تمام متعلقہ اداروں اور افراد کی چھان بین کی جائے اور ہائی جیکروں کو واپس لایا جائے ۔

غالباً حکومت اس وجہ سے چشم پوشی کرتی رہی کہ پیپلز پارٹی کی بڑی قوت ہے ، اور اگر اُسے چھیڑا گیا تو مشکل ہوگی ۔ حالانکہ بڑی قوت ہونے کا تصور بھی ایک فریب نظر ہے ۔ پارٹی جب انتہائی عروج پر تھی تب بھی انتخاب میں اس کی کامیابی نہائی ووٹوں سے کم پر ہوئی تھی ۔ جولائی ۱۹۷۷ء کے فوراً بعد انتخابات ہوتے تو یہ پیمانہ اور بھی گر جاتا ۔ ویسے بھی پچھلے چند سال میں اس پارٹی کے اثرات دھیمے پڑ گئے ہیں ۔ آئندہ اگر جداگانہ انتخابات متناسب نمائندگی کے مطابق ہوں اور پیپلز پارٹی رجسٹریشن کرا کے شامل بھی ہو جائے ، تو دس پندرہ فی صد سے زیادہ تعداد ووٹوں کی اُسے نہ ملے گی ۔ خواہ مخواہ کی مرعوبیت کا بوجھ لاد رکھنے سے کام اور خراب ہوا ہے ۔

اب بھی حکومت کو غور کرنا چاہیے کہ طیارے کے اغوا کا حادثہ منفرد واقعہ نہیں ، بلکہ اس کے بعد کچھ اور چیزیں بھی پیش آسکتی ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ باہر کی جمع شدہ قوت اپنی آزاد حکومت قائم کر کے پیپلز لبریشن آرمی منظم کرے ، اس کے چھاپہ مار دستے روسی اور کارملی سپاہیوں سے مل کر افغانستانی سرحد سے حملے کریں ۔ ادھر اندرونِ ملک کچھ وقفے کے بعد پھر ہنگامہ آرائی کرائی جانے لگے ۔

پس اب بھی وقت ہے کہ حکومت پاکستان کے تحفظ اور معاشرے کے امن کو بچانے کے لیے نہایت مضبوط اور مؤثر تدابیر اختیار کرے ۔

سلسلۂ گفتگو میں سردار عبدالقیوم صاحب کا بیان بھی ایک موضوع بن گیا ہے ۔

پہلے تو اس پر مبارک باد کہ سردار صاحب کو ہوش آ گئی اور انہوں نے سمجھ لیا کہ پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر چلا نہیں جا سکتا ۔ مگر سوال یہ بھی، تو ہے کہ جس دن آپ ایم آر ڈی میں شامل ہوئے تھے، کیا اُس دن اس پارٹی کے سابق جرائم اور اُس کا تشدد پسندانہ کردار سامنے نہیں تھا؟ برسوں ایک جماعت نے آپ کے سامنے اپنے نظریات بیان کیے، اپنے اسلوبِ کار کا مظاہرہ کیا ۔ خود آپ کو دلائی کیمپ میں رکھ کر اپنے سیاسی فلسفے کا عملی روپ دکھایا ۔ پھر مرتضیٰ بھٹو، شاہنواز بھٹو، پھر جسٹس صفدر کی نقل و حرکت ہی نہیں، اُن کے بیان اور انٹرویو آپ کی نظر سے گزرے، بیگم صاحبہ اور بے بی صاحبہ کی اوچھی حرکتیں آپ نے بار بار ملاحظہ فرمائیں اور ابھی ماضی قریب میں پیپلز پارٹی کے سرغنوں نے کرمل حکومت کو تسلیم کرنے کے ارادے ظاہر کر کے قوم پر یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ روسی ٹینکوں کا استقبال کرنے کے لیے گلدستے اور ہار لیے کھڑے ہیں ۔ اس سارے دور میں اگر آپ کو پارٹی کی مخصوص جبلت کا اندازہ نہیں ہو سکا تو آپ اپنی سیاسی بصیرت کے متعلق خود ہی رائے قائم کیجیے ۔ جو شخص دوسروں کا لیڈر بن سکے اُٹھا ہو، اگر ملک کے افراد اور گروہوں کو سمجھنے میں وہ یہی کمال دکھائے کہ طیارہ اغوا ہونے کے بعد اُسے یکایک معلوم ہو کہ اس میں تو پیپلز پارٹی کا ہاتھ ہے ۔ اور یہ پارٹی تشدد پسند ہے، تو پھر پیروؤں کا کیا بنے گا؟ ایک آپ ہی نہیں، بڑے یا چھوٹے سات آٹھ گروہوں کے لیڈر صاحبان آپ کے ساتھ شریک تھے ۔ اِن میں سے کسی کی بصیرت بھی پیش پا اُفتادہ حقیقت کو نہ پا سکی ۔ کیا اِن صلاحیتوں کے ساتھ ملک کی سیاسی قسمت سے کھیلنا اچھی بات ہے؟ کیا لیڈروں کا ذہنی معیار ایسا ہی ہونا چاہیے؟

اب اگر سارا بھانڈا پھوٹ گیا ہے تو پھر ایم ۔ آر ۔ ڈی کے کچے ہیولے سے علیحدگی کا فیصلہ کرنے میں اتنا اہتمام کیوں کہ سارے شرکا سے مل کر فیصلہ کیا جائے ۔ وہ ایک فاسد تنظیم کا ڈھانچہ تھا، جو ابھی تک مکمل طور پر تشکیل یافتہ بھی نہیں ہے ۔ آپ پر اگر یہ راز کھل گیا ہے کہ اصل چیز پیپلز پارٹی تھی اور وہ اس محاذ کو استعمال کرنا چاہتی تھی ۔ اور یہ کہ اب یہ نام (ایم ۔ آر ۔ ڈی) بدنام ہو گیا ہے، تو پھر کیوں نہ یک قلم آپ نے اپنے آپ کو اس سے الگ کر لیا ۔ بقیہ لوگوں سے بعد ازاں بھی بات چیت ہو سکتی تھی ۔ (تازہ ترین اطلاع کے مطابق سردار صاحب نے ارادہ بدل لیا ہے ۔)

مجھے بڑا افسوس ہوا کہ سردار عبدالقیوم اور نواب زادہ نصراللہ خاں جیسے حضرات جنہوں نے برسوں میں اپنا ایک مقام بنایا تھا، "آناً فاناً" اُسے (ایم - آر - ڈی) کی بھینٹ چڑھا آئے —— افسوس ہے اُس نقصان پر جو انہوں نے اپنے آپ کو پہنچایا اور جس کی وجہ سے آئندہ بھی جن حلقوں میں بیٹھیں گے اُن کی قدر و قیمت بھی گرے گی -

غیر مشہور مثل کے مطابق صبح کے بھولے اگر شام کو ٹھکانے پر واپس آجائیں تو اُن کا خیر مقدم کرنا چاہیے - پس محبانِ وطن سردار صاحب کی واپسی پر خوش آمدید کہتے ہیں -

---

کالعدم پیپلز پارٹی یا بیگم نصرت صاحبہ کیا تھیں اور کیا ہیں، اِس سے قطع نظر ہمارے وارفتگانِ جمہوریت کو ایک اور بات بھی سوچنی چاہیے تھی وہ یہ کہ آیا آج حالات ایسے ہیں کہ اُن میں پُر ہنگامہ تحریکیں کھڑی کی جائیں -

افغانستان میں روس پرست حکومت کے قیام اور روسی فوج کے داخلے کے بعد پاکستان مشکل ترین حالات سے دوچار رہے - ایک طرح کی سرد جنگ جاری ہے اور جاسوسی، ریشہ دوانی اور سازش کاری کے چکر چل رہے ہیں - جنوب مشرق سے بھی مسلسل تار ہل رہے ہیں - اِس ملک کو توڑنے کے لیے ایک بار پھر بالائی سطح پر سرگوشیاں ہیں - کمیونسٹ اور سیکولرسٹ عنصر پہلے ہی چھاپہ ماری کے تجربے کر رہا ہے اور سیاسی قتل کے متعدد واقعات میں ملوث ہے - افغانستان کے دس پندرہ لاکھ بھائیوں کی موجودگی ہمارے لیے بڑی ذمہ داریاں لے کے آئی ہے - اور اس بھاری مسئلے پر مسلسل بھرپور توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے - اگر یہ حقیقت ہے کہ افغان مجاہدین کی معرکہ آرائی ہمارے لیے ذریعہ تحفظ ہے تو پھر ہم پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ ہم افغانستان کے زخمیوں، معذوروں اور مجبورانہ حالات میں ملک چھوڑنے والوں کے لیے انصار بنیں - اور اپنے ہاں کوئی ایسا طوفان نہ اٹھائیں کہ خود ملک کی توجہات بھی مجاہدین و مہاجرین سے ہٹ جائیں اور ساتھ ہی دنیا کی نگاہیں بھی اُدھر سے ہٹ کر ہماری طرف لگ جائیں -

سردار عبدالقیوم اور دوسرے لیڈروں کو یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ ہر راگنی اپنے وقت ہی پر اچھی لگتی ہے - کیا ہی بُرا وقت چھانٹا آپ لوگوں نے ملک میں گرم تحریک اٹھانے کے لیے اور کس موقع پر آپ نے دھمکیوں کی زبان استعمال کی، کیا یہ حقیقت نہیں کہ ایم - آر - ڈی کے وجود کا اعلان ہوتے ہی

اور اُس کی طرف سے تحریک اُٹھانے کا ارادہ ظاہر ہوتے ہی مختلف دائروں سے مطالبے لے کر متعدد طبقے اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ہڑتالوں اور مظاہروں اور حکومت سے کشمکش کا آغاز کر دیا ۔ ڈاکٹروں اور وکیلوں اور طلبہ نے ہنگامہ خیز سیاست کی سڑک پر مارچ شروع کر دیا ۔ اگر خدانخواستہ یہ سلسلہ جاری رہتا تو پاکستان سیدھا روس کے سایے کے نیچے ببرک کارمل کی گود میں ہوتا ۔ اور آپ بتائیے کہ پھر آپ کو جمہوریت کہاں سے ملتی اور جمہوریت کا استعمال آپ کیا کرتے ۔ جمہوریت کی ضرورت ہمیں تب ہے کہ پاکستان کا وجود اور اُس کی آزادی محفوظ ہو ۔ اگر خدانخواستہ یہ وجود اپنی آزاد صورت میں برقرار نہ رہے تو پھر جمہوریت کوئی کوکا کولا کی بوتل تو نہیں کہ جو حالات بھی ہوں اُس کا ڈھکن کھول کر آپ چسکیاں لیتے رہیں ۔

زندگی کی تمام سرگرمیوں میں کچھ ترجیحات (PRIORITIES) ہوتی ہیں ۔ اسی طرح سیاست میں وقت وقت کی ترجیحات ہوتی ہیں کہ پہلے کیا اور پھر کیا ؟ اس وقت کا ترجیحی مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان کی کشتی اس گرداب سے صحیح سلامت نکل جائے ، جو حالات کے بگولوں سے بن گیا ہے ۔ یہ ہو چکے تو اندر کے جھگڑے طے کیے جاتے رہیں گے ۔ ترجیحات کو ملحوظ رکھ کر موزوں وقت کا انتظار کرنا اور جلد بازی سے بچنا صبر اور ایثارِ جذبات کا راستہ ہے ۔ اور یہ سیاست کی اہم ترین ضروریات ہیں ۔

آپ کو دیکھنا یہ بھی چاہیے تھا کہ قوم کی مجموعی عوامی فضا کسی معاملے میں ساتھ دینے کے لیے تیار ہے یا نہیں ؟ افسوس کہ اس کا اندازہ بھی آپ نہ کر سکے ۔ بلاشبہ سوچنے سمجھنے والے لوگ جمہوری فضا کے طلب گار ہیں ۔ یقیناً معاشی مسائل کی وجہ سے غریب طبقے مضطرب ہیں ۔ سچ ہے کہ ہر طرف خیانت اور بدعنوانی کا جو دور دورہ ہے اُس نے جمہور کو احساسِ تحفظ سے محروم کر رکھا ہے ۔ لاریب جرائم کا چڑھتا ہوا طوفان اور بے حیائی کا ریلا لوگوں کا سکھ چین چھین رہا ہے ۔ درست کہ حکومت کی پالیسیوں کا تضاد اور جھول ، نیز اسلام کی راہ میں ہونے والی ادھوری کارروائیاں ، ذمہ داروں کے فیصلوں کے خلاف زیریں عملے کا ٹیڑھا رویہ ، یہ ساری چیزیں حالات سے بیزاری پیدا کرتی ہیں ، مگر دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان کی محبِ وطن اکثریت ، خصوصاً اس کے دینی عناصر کسی بھی طرح اس پر راضی نہیں ہیں کہ کوئی چیز ملک کے لیے خطرہ بنے ، یا ہنگامہ آرائی کا طوفان قومی املاک اور دفتری کارکردگی اور کاروباری سرگرمی اور تعلیمی اداروں کے لیے ضرر رساں ہو ۔ چنانچہ ایم آر ڈی

کے ظہور پر تھوڑی بہت جو گرما گرمی پیدا ہوئی، عوام نے اُسے اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا خصوصاً طیارے کے اغوا نے تو اُن کی آنکھیں کھول دی ہیں۔

وہ گھٹیا سیاست باز ہوتے ہیں جو حکومت و قیادت سے ناراض ہو کر سارا انتقام ملک و قوم سے لیتے ہیں۔ سوال یہ نہیں کہ صدر ضیاء الحق ضرور رہیں اور اُن کا نقشۂ کار حرف بہ حرف صحیح ہے، بلکہ آنجناب سے مجھے بھی اختلافات ہیں، فوجی حکومت کا سلسلہ دراز ہوتے جانے سے مجھے بھی اضطراب ہے، اُن کے اقدامات اور پالیسیوں پر مجھے بھی اطمینان نہیں ہے۔ میں بھی موجودہ نقشۂ احوال میں تبدیلی چاہتا ہوں، مگر مجھے کسی طرح گوارا نہیں ہے کہ موجودہ صدر اور نظام کے خلاف طوفانی ٹکراؤ کا آغاز کر کے میں ایک طرف ملک کے اندر کے تخریبی عناصر کے ہاتھ مضبوط کر دوں اور دوسری طرف روس اور ببرک کابل اور بھارت کے لیے اپنے قومی گھر کے پھاٹک کھول دوں۔

جسے سیاسی کام کرنا ہو، اور خاص طور پر قیادت کرنی ہو اس کے کچھ اُصول ہونے چاہییں۔ کیسے عناصر کے ساتھ میل جول ممکن ہے اور کن کے ساتھ نہیں؟ کیسے مواقع پر حکومت سے آویزش نہیں کرنی چاہیے۔ کیا کیا طور طریقے اور کیا کیا اندازِ گفتگو اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ساری باتیں طے کر کے میدان میں آنا چاہیے اور آنے کے بعد برسوں تک اپنے کردار سے مظاہرہ کرنا چاہیے کہ لیڈر اپنے اصولوں کے وفادار ہیں۔ سیاسی کردار کا سکہ ایک دفعہ کھوٹا ہو جائے تو پھر کبھی از سرِ نو اس کا کھرا پن نہیں منوایا جا سکتا۔

اب ایک تلخ تجربے نے جو سبق دیا ہے اس کے تحت محبِ دین و وطن سیاسی جماعتوں اور اُن کے لیڈروں کو طے کر لینا چاہیے، اور اس پالیسی کو (DECLARE) کر دینا چاہیے کہ اوّلاً ہم جب کبھی متحد ہوں گے اور جب بھی کوئی محاذ بنائیں گے تو ایک تو ہمیشہ جانی پہچانی محبِ دین و وطن جماعتوں کے ساتھ مل کر بنائیں گے۔ دوسرے کسی ایسے مرحلے پر کوئی گرم تحریک نہیں اُٹھائیں گے جس کا بالواسطہ اثر ملک کی آزادی، سالمیت، استحکام اور عزّ و وقار کے خلاف پڑتا ہو۔ تیسرے سیاسی تحریک کے لیے ایسے طور طریقے اختیار نہیں کریں گے جن سے تخریبی عناصر کو اُبھرنے اور قومی املاک کو تباہ کرنے اور ملک کے بے گناہ باشندوں کو اذیت دینے کا موقع ملے۔

خاص طور پہ دینی جماعتوں اور اداروں اور اشخاص کے لئے تو شدید طور پر لازم ہو گیا ہے کہ وہ

سیاسی اور فقہی اور فرقہ وارانہ جھگڑوں کے دفتر لپیٹ کر وقت کے دریا میں بہا دیں اور اختلافات رکھنے کے باوجود شانوں سے شانے ملا کر الحاد اور لادینیت اور سیکولرازم اور سوشلزم کے علانیہ اور خفیہ حملوں کے خلاف فکری و سیاسی جہاد کا محاذ آراستہ کریں۔ اگر احیائے اسلام کے مقصدِ جلیل کے بجائے اپنی اپنی گروہی یا ذاتی برتری کی غلط جد و جہد جاری رہی، اگر آپس کے ہر اختلاف پر کشاکش ہوتی رہی اگر ایک دوسرے کے خلاف اسٹیجوں اور لاؤڈ سپیکروں اور پریس کے ذریعے "فساد فی سبیل اللہ" جاری رہا تو گویا آپ نے اس بڑی لڑائی میں ملت کی ویسی ہی شکست کا سامان کر دیا جیسی شکست سمرقند و بخارا میں پیش آئی تھی۔

محب دین و وطن جماعتوں کی قوت جہاں مخالفینِ اسلام و پاکستان کی مساعی کے خلاف متحرک ہو وہاں وہ یہ کوشش بھی ضرور کرے کہ فوجی نظامِ حکومت، سول نظامِ حکومت میں بدلے اور یہاں ایک جواب دہ قیادت برسرِ اقتدار آئے، نیز نفاذِ اسلام کے اقدامات ادھورے، متفرق اور متضاد نہ ہوں، اور نہ ایسی انتظامیہ اُن کو غلط مفہوم دے کر اور اُن کی عملی شکل بگاڑ کر ستیاناس کر سکے جس میں ہر سطح پر مخالفینِ اسلام، مخالفینِ پاکستان، فدائیانِ مغرب، پرستارانِ اشتراکیت، وفادارانِ رُوس اور خدمت گارانِ نفس بیٹھے ہوئے ہیں۔ مطلوب یہ ہونا چاہیے کہ ایک متعین منصوبے اور تفصیلی نقشۂ کار کے تحت احسن ترتیب سے اقدامات ہوں۔ اور ان اقدامات میں جہاں کہیں سے خلل اندازی ہو، اقتدار کی نگاہ بھی فوراً وہاں پہنچے اور اُس کا آہنی پنجہ بھی۔

نوٹ: یہاں سے آگے مستقبل کے لیے حکومت کے سامنے کچھ مشورے رکھے گئے تھے، لیکن عبوری آئین کے نفاذ نے پوری صورتِ حالات بدل دی ہے اور اس پر از سرِ نو تفصیلی غور کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ لہٰذا باقی باتیں پھر کبھی!

رسائل و مسائل

قیدی مجاہدین اور نماز قصر، صدقۂ فطر

ملک غلام علی صاحب

سوال: ۔ ا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہ کے زمانوں میں جنگیں ہوتی تھیں اور ایک دوسرے کے جنگی قیدی بھی بنتے تھے۔ کیا کوئی مثال ہے کہ کسی صحابی نے دورانِ قید نمازِ قصر پڑھی ہو یا پوری پڑھی ہو۔ اگر کوئی ایسی مثال ہو تو براہ کرم اس کی نشاندہی کر دی جائے۔ کتاب کا حوالہ ضرور دیں۔ کیونکہ ایک صاحب نے کہا ہے کہ جو مجاہدین ۱۹۷۱ء کی جنگ میں انڈیا میں قید تھے وہ نماز قصر نہیں کر سکتے تھے۔ اب اُن کو دوبارہ پوری نمازیں دہرانی ہوں گی اور کچھ دوست بڑے پریشان ہیں اور اس مسئلے پر رہنمائی چاہتے ہیں۔

ب ۔ زکوٰۃ کی طرح صدقۂ فطر بھی صاحب نصاب پر واجب ہے یا ہر مسلمان پر لازم ہے۔

جواب: ۔ آپ کا خط ملا۔ آپ کے سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں۔

ا ۔ جن صاحب نے یہ کہا ہے کہ جو مجاہدین ۱۹۷۱ء کی جنگ میں انڈیا میں قید تھے وہ نماز قصر نہیں کر سکتے تھے۔ اور اب اُن کو دوبارہ پوری نمازیں دہرانی ہوں گی، ہمیں اُن کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔

جو مسلمان اپنے وطن سے باہر نکل کر مسافت پر روانہ ہوتا ہے وہ جب تک کم از کم پندرہ دن کے قیام کا ارادہ نہیں کر لیتا وہ مسافر کی تعریف سے خارج نہیں ہو سکتا۔ مسلمان مجاہدین دارالحرب میں خواہ آزادی کی حالت میں مصروف جہاد ہوں یا دشمن کے اسیر ہوں اُن کا دارالحرب میں رہنا بلا تعین مدت یا غیر اختیاری ہے اس لیے اُن پر مسافر ہی کی تعریف صادق آتی ہے۔ اس پر اکثر فقہاء و محدثین کا اتفاق ہے کہ جس مقام پر مجبوراً ٹھہرنا پڑے اور ہر وقت بہ نیت ہو کہ رکاوٹ دور ہوتے ہی

اِن شاء اللہ واپس ہوں گے تو وہاں جتنی مدت بھی قیام ہو، نماز قصر پڑھی جائے گی۔

جنگی حالات کی وجہ سے بعض صحابہ کرام کو بعض مقامات پر بلا ارادہ مجبوراً کئی کئی ماہ تک ٹھہرنا پڑا اور اس دوران میں وہ قصر کرتے رہے۔

حضرت انسؓ دو سال تک شام میں رُکے رہے اور نماز قصر ادا کرتے رہے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب کبیری میں مصنّف لکھتے ہیں۔

"اجمع اھل العلم علی ان المسافر یقصر مالم یجمع اقامۃ۔

(اہلِ علم کا اس پر اجماع ہے کہ مسافر جب تک اقامت کا عزم و ارادہ نہ کرے وہ قصر کرے گا)۔

حضرت عمرؓ کا بھی یہی قول نقل کیا ہے اور پھر لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام "رام ہرمز" میں نو مہینے ٹھہرے رہے اور قصر کرتے رہے۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں بیہقی سے نقل کیا ہے کہ وہ آذربائیجان میں ایک جنگ کے موقع پر برف کی وجہ سے چھ مہینے ٹھہرے رہے اور وہ اور دوسرے صحابہ قصر کرتے تھے۔ پھر آگے مصنّف یہ بھی لکھتے ہیں کہ دار الحرب میں اگر اقامت کی نیت کر بھی لی جائے تو اس کی صحت معتبر نہ ہوگی۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ دشمن کو شکست دیں اور ٹھہرے رہیں اور ہو سکتا ہے کہ دشمن انہیں شکست دیں اور انہیں وہاں سے ہٹنا پڑے۔ اُن کی یہ حالت اُن کی اقامت کے عزم و ارادہ کو باطل کر دیتی ہے اور اقامت کے لیے نیت کا جزم اور تحقق لابدی ہے۔ اسی طرح آگے انہوں نے مفصل بحث کی ہے جس کا پورے طور پر نقل کرنا نہ ممکن ہے نہ ضروری ہے۔

۲ — صدقہ فطر کا نصاب تو وہی ہے جو زکوٰۃ کا ہے۔ لیکن زکوٰۃ کے نصاب میں فقط سونا چاندی، نقد سرمایہ یا مالِ تجارت کا اعتبار ہے۔ لیکن صدقہ فطر اس شخص پر بھی واجب ہو جاتا ہے جس کے پاس اُس کی خانگی حاجاتِ اصلیہ یعنی ناگزیر ضروریات سے بڑھ کر کسی طرح کا بھی مال یا سامان ہو اور اُس کی قیمت نصابِ زکوٰۃ کے برابر ہو۔

مطبوعات

انقلاب ایران
(اسباب اور نتائج)
از احمد عبداللہ۔ ترجمہ نسیم ملک
صفحات ۱۱۶ قیمت ۵/- روپے
ناشر: تنظیم پبلی کیشنز
۴۴۶ - بہادر آباد - کراچی

روزنامہ ڈان کے ایک مضمون نگار جناب احمد عبداللہ جنہوں نے تاریخ و سیاسیات میں ایم اے کیا ہے۔ اور اس سے قبل بھی دو کتابیں لکھ چکے ہیں۔ اس کتاب کے مؤلف ہیں جس کا ترجمہ نسیم ملک نے انگریزی سے اردو میں کیا ہے۔

ایران جس کا رقبہ ۶ لاکھ ۳۶ ہزار ۲ سو ۹۳ مربع میل ہے۔ آبادی ساڑھے تین کروڑ سے کچھ کم اور قومی پیداوار ۵۰ ہزار ملین ڈالر سالانہ ہے (یا تھی) آج اپنے انقلاب کی وجہ سے دُنیا بھر میں ایک نمایاں موضوعِ فکر ہے۔ یہی زیر نظر کتاب کا موضوع ہے۔ مگر موضوع کا تعلق اختصاصی طور پر ایرانی انقلاب سے ہے۔ " اسباب و نتائج " میں سے پہلے جزو پر تو کچھ مواد ہے " نتائج " پر کوئی اہم بحث نہیں۔ زیادہ تر یہ کتاب پس منظر کو سامنے لاتی ہے۔ اور خاصی مفید معلومات ہیں، جو مؤلف کے مطالعہ کی نشاندہی کرتی ہیں۔

خصوصاً تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے ایران کے مذہب پر جو گفتگو کی گئی ہے۔ اردو میں اس کی بہت ضرورت ہے۔ ایران کا نو صدیوں تک سنی مسلک پر رہنا اور سنی نقطۂ نظر کے علماء کا عظیم علمی خدمات انجام دینا تاریخ کا بڑا اہم باب ہے۔ یہ تو سولھویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے کہ صفوی خاندان نے بزورِ شمشیر شیعیت کو ایران کا مذہب قرار دیا۔ اور دو سو سال کی مدت میں یہ نتیجہ پیدا ہوا کہ ایران میں شیعہ آبادی کی اکثریت ہو گئی۔ آج کے ایرانیوں میں دورِ رفتہ کے جبر کا کوئی ردِعمل موجود نہیں ہے کہ ایک چیز اُن پر بزورِ شمشیر ٹھونسی گئی تھی۔

اس مختصر کتاب کا ایک اہم حصہ ایران میں بیرونی طاقتوں کے استحصال کی داستانِ خونچکاں کا ہے، جس کا آخری عمل یہ تھا کہ ایران کو لادینیت کی طرف دھکیلا جائے اور اس مقصد کے لیے شاہ کو آلۂ کار بنایا گیا اور اُس کو جمہوریت کشی اور تشدد کاری کے گُر سکھائے گئے۔ مگر ایران کے مذہبی اکابر وہ واحد قوت تھے جو شاہ کے مظالم، اس کے سامراجیت پرستانہ جبری اقدامات، بہائی تحریک کی پرورش اور سیکولرازم کے لیے

اس کے پروگراموں کی مخالفت میں آوازیں اٹھاتے رہتے ۔ آخر اس طبقے پر بھی مظالم کا آغاز ہوا اور تشدد کا پہلا زوردار ریلا شاہی محل سے ۱۹۶۳ء میں اٹھا۔

اس پس منظر کے ساتھ ایرانی انقلاب نمودار ہوا جسے مولف نے مقصد کے لحاظ سے پاکستان قومی اتحاد کی تحریک ۱۹۷۷ء سے ہم آہنگ قرار دیا۔ اور ایرانی انقلاب کے دورِ آغاز کو ان الفاظ سے پیش کیا "یہ جدوجہد استحصال، دہریت، بدکرداری، بدعنوانی، جابرانہ آمریت، اور سب سے بڑھ کر بیرونی مداخلت کے خلاف جنگ ہے۔

ایرانی انقلاب پر ہمارے سامنے دو اور کتابیں رکھی ہیں۔ ان پر آئندہ ریویو کرتے ہوئے اس کی "فتوحات" اور اس کی پیچیدگیوں پر ہم مختصراً اظہارِ خیال کریں گے۔

سید مودودیؒ کا عہد (میری نظر میں)
از سید نقی علی صاحب
صفحات پونے پانچ سو
قیمت اعلیٰ ۳۶ روپے عام ۲۷ روپے
ناشر: البدر پبلی کیشنز اردو بازار لاہور

مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور کی رحلت کے بعد سے ہر طرف یہ جاننے کی ایک پیاس پیدا ہو گئی ہے کہ مولینا کی زندگی تفصیلاً کیسے گزری۔ اس کے لئے جہاں یہ طویل المیعاد منصوبہ ہمارے سامنے ہے کہ مولینا کی سوانح مرتب کر دی جائے، وہاں مولینا سے قریب رہ کر زندگی گزارنے والے اصحاب بہت کچھ لکھ رہے ہیں۔ سید نقی علی صاحب نے بھی زندگی کا بڑا حصہ مولینا مودودی مغفور کے ساتھ کام کرتے ہوئے گزارا ہے۔ ان کی قوت مشاہدہ بھی زوردار ہے اور حافظہ بھی مضبوط۔ لہٰذا ان کی لکھی ہوئی کتاب "سید مودودی کا عہد — میری نظر میں" خاصی قابلِ توجہ ہے۔ اس میں "الف" سے لے کر "یا" ہر دور کی دلچسپ اور مفید جزئیات برادرم نقی صاحب نے پیش کر دی ہیں۔ مولینا کی شخصیت اور مغفور کے کردار کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس کتاب میں مولینا کی دعوت بھی ملے گی، تقاریر کے اقتباسات بھی درج ہیں۔ مختلف مراحل کے کاموں کی نوعیت بھی سامنے آجاتی ہے اور ذاتی زندگی کے بعض پہلوؤں کے ساتھ مولینا کے لطائف بھی خراجِ توجہ لیتے ہیں۔

اور سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ مولینا مودودی مغفور کے ساتھ ساتھ سید نقی علی صاحب کی شخصیت کا سارا ریکارڈ بھی مطالعہ کو موجود ہے۔ یعنی آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام بھی۔ شاید نقی علی صاحب کو یہ محسوس بھی نہیں ہوا ہو گا کہ اس کتاب میں ان کی خودنوشت سوانح بھی ایک حد تک آگئی ہے

مجھے اس کتاب کے عنوان سے اختلاف ہوا۔ میں لفظ "عہد" کا مفہوم یہ نہیں سمجھتا کہ ایک شخص کا دورِ عمر ختم ہوا

تو اس کا عہد بھی ختم ہو گیا۔ یہ کسی صدرِ مملکت یا وزیر کا قصہ نہیں ہے کہ اس کے پانچ یا دس سال کے دورِ حکومت میں کیا ہوا۔ اہلِ فکر و نظر اور اربابِ دعوت و تحریک کا اصل دور تو اُن کی حیاتِ جسدی ختم ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ مولینا مودودی مغفور کا دور اس وقت تک رہے گا جب تک اُن کے طرزِ فکر، اُن کے اندازِ دعوت، اُن کی اصطلاحات اور اُن کی خاص تراکیب و تشبیہات اور اُن کے اسلوبِ تحریک کو لے کر چلنے والے لوگ اُٹھتے رہیں گے۔ یوں بھی جب بات "میری نظر میں" کی ہو، تو مولینا مودودی کی زندگی کے دور کو بھی بیان کرنے کے لیے اُن کے پورے ماحول، معاصر تحریکوں اور نظریہ حریفانہ کام کرنے والی شخصیتوں اور سیاسی حکومتوں اور قیادتوں کا تحقیقی جائزہ لینا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ یہاں تو بات اس حد تک محدود رہے کہ "مولینا مودودی — میری نظر میں" (یا میرا مطالعہ و مشاہدہ) اور آگے بڑھتا ہو تو "مولینا مودودی اور اُن کی دعوت اور تحریک"۔

سوانحی کتابوں میں جن کا مقصود شخصیت کا جائزہ یا کردار کا مطالعہ ہو، کتابوں اور تقریروں کے اقتباسات کا عنصر زیادہ نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ یہ سب کچھ تو مطبوعہ موجود ہے۔ مشاہدات زیادہ ہونے چاہئیں یا ایسے واقعات کا تذکرہ جو ریکارڈ پر نہیں ہیں یا پوری طرح نہیں ہیں۔ آج کل کتابوں کی ضخامت کا بڑھ جانا ایک مسئلہ ہے۔

تحریکِ پاکستان

از پروفیسر محمد خلیل اللہ، اُردو کالج کراچی

ناشر: شعبۂ تالیف و ترجمہ وفاقی گورنمنٹ اُردو کالج۔ کراچی

صفحات: ۵۹۰۔ ٹائیٹل آرٹ کارڈ

قیمت: -/۵۰ روپے

تحریکِ پاکستان اور نظریہ پاکستان کو سمجھنے کی ضرورت اُس کشمکش کی وجہ سے بڑھ گئی ہے جو دینی عناصر کے خلاف سیکولر، مغرب پرست اور سوشلسٹ عناصر نے شروع کر رکھی تھی، خصوصاً پاکستان کے ایک حصے کے انقطاع، ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۷ء کی فسطائیت اور تحریک نظام مصطفیٰ ۱۹۷۷ء کے اُبھار کے واقعات نے اہلِ نظر کو اس طرف متوجہ کیا ہے کہ وہ نئی نسلوں کو پاکستان کی معنویت اور اساس اور اُس کے پس منظر کا شعور دلائیں۔

ادھر چند برس کے عرصے میں پاکستان اور نظریۂ پاکستان پر بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں سے بعض کی نوعیت تحقیقی ہے، بعض درسی ضرورت سے لکھی ہیں، بعض عام مطالعہ کے لیے ہیں —

پیشِ نظر کتاب اعلیٰ مدارج کے طلبہ کے لیے بھی مفید ہے اور عام مطالعہ کے معیار سے بھی پسندیدہ۔ یہ کتاب اپنے قارئین کو بتاتی ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھیننے کے بعد ان کو سیاسی معاشرتی اور اقتصادی حیثیت سے کس قدر مصیبت سے گذارا۔ دوسری حقیقت اس کے ذریعے یہ واضح ہوتی ہے کہ ہندو قوم کے برہمن مہاجنی امپریلزم نے انگریزی دور میں شروع سے آخر تک مسلمانوں کو دبانے اور کچلنے کی کس طرح کوشش کیں۔ ہندوؤں کا یہی وہ رویّہ تھا جنہوں نے مسلمانوں کو جو ایک قوم پرستانہ لادین جمہوری طرزِ سیاست سے ہٹایا۔ اور اُن کو اپنے جداگانہ ایمانی و تہذیبی وجود کا شعور دلایا۔ اس کے بعد یہ کتاب اس حقیقت کو سامنے لاتی ہے کہ اپنی جداگانہ مسلم حیثیت کے شعور نے کس طرح اس تحریک کو پروان چڑھایا، جس کے نتیجے میں پاکستان تشکیل پذیر ہوا۔

کتاب میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں جن کی ایک وجہ "طوالت کا خوف" ہے۔ اس کا اثر یہاں تک پڑا ہے کہ مرکزی نوعیت کے مبحث دو قومی نظریہ پر صرف ایک صفحے کے مواد میں یہ بیان ہوا ہے کہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سندھ کی صوبائی مسلم لیگ نے کراچی میں یہ بات واضح الفاظ میں بیان کر دی کہ "ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں"۔ (ص ۳۰۶ - ۳۰۷) آخر عام آدمی کو یا نئی نسل کے ایک طالب علم کو کیا یہ سوال نہیں گھیرے گا کہ وہ الگ الگ قومیں کیوں ہیں اور دو قومی نظریہ کیا ہے؟ اور اس سوال کا جواب دو قومی نظریے کی فصل تو نہیں دیتی۔ دوسرے مقامات پر بھی اشارات ہی ہیں۔ غالباً یہی طوالت کا خوف ہے جس کی وجہ سے "جداگانہ مملکت کی تحریکیں" (باب ۱۶) کے زیرِ عنوان بعض غیر اہم افراد کے سرسری خاکے تو آگئے ہیں مگر پچھلی نصف صدی کی فکر و سیاست کے ایک اہم کردار مولینا مودودیؒ کا تیسرا خاکہ نظر انداز ہوا۔ دلچسپ تر یہ کہ نہ کتابیات میں "مسئلہ قومیت" یا "سیاسی کشمکش" (از مولینا مودودیؒ) کا ذکر، نہ اسماء کے اشاریے میں کوئی حوالہ۔ تاریخ کے اسٹیج کے ایک مکمل کردار کو سرے سے غائب کر دینا تاریخ نویسی کا کمال ہے۔

مؤلف نے اختلافی نوعیت کے مسائل سے بھی بچنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ سرسیدؒ کی فکر اور اُن کے کام کے چند بیش پا افتادہ پہلو تو بیان ہوتے، مگر انہوں نے قومِ غالب کے آگے جس روشِ کمتری کو اپنایا اور جس کے اثرات ان کے مذہبی تصورات پر بھی پڑے، اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں۔[۱] بلکہ یہ کہہ

[۱] آگے صفحہ ۳۰۸ پر جاکے مؤلف نے تلافی کی ہے۔ مگر کوئی عام آدمی یا طالب علم سرسیدؒ کے متعلق لکھنے یا بولنے کے لیے مواد اخذ کرنا چاہے گا تو باب نمبر ۲ میں "سرسیدؒ" کا عنوان ہی نکالے گا۔

ان کی تحسین کی گئی ہے کہ وہ "حقیقت پسند انسان تھے"، خواب نہیں دیکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان نئے نظام میں اپنا مقام پیدا کریں۔ حالانکہ آزادی کی جنگ پہلے بھی جن لوگوں نے لڑی تھی وہ نئے نظام میں مقام بنانے والے لوگ نہ تھے اور بعد میں بھی آزادی و استقلال کے لیے جو مہم چلی ہے وہ "مقام بنانے والوں" کی مرہونِ منت نہیں ہے۔ اختصار اور چیز ہے اور تاریخ کے ساتھ انصاف اور چیز۔ مؤرخ (کسی درجے کا بھی ہو) دراصل ٹکراتی ہوئی قوتوں کے متعلق قلم اٹھاتا ہے تو وہ ایک طرح سے جج کی پوزیشن اختیار کرتا ہے۔ امید ہے کہ پروفیسر محمد خلیل اللہ ان خیر خواہانہ گزارشات پر غور کریں گے۔

کلمہ طیبہ اور فلسفۂ نماز

از مولانا سید فردوس شاہ قصوری

صفحات ۱۱۲، قیمت ۶/ روپے

ناشر: مکتبۂ نذیریہ

منیر شہید روڈ۔ بالمقابل جاوید مارکیٹ

اچھرہ۔ لاہور

مکتبہ نذیریہ کچھ عرصے سے مسلسل تبلیغی لٹریچر چھاپ رہا ہے یہ مختصر کتاب بھی اس کے سلسلۂ خدمات کی ایک کڑی ہے اور اسے مولینا سید فردوس شاہ صاحب نے قلمبند فرمایا ہے۔ سید صاحب ایک ایسے خادم دین بزرگ ہیں کہ ان کی تحریروں پہ تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے کچھ بوجھ سا محسوس ہوتا ہے۔ پس میں تعارف ہی پہ اکتفا کرتا ہوں۔

بہ حیثیت مجموعی یہ مفید رسالہ ہے اور اس میں سادہ طریقے سے مگر قرآنی دلائل اور احادیث اور بزرگوں کے حوالوں سے باتوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ زیادہ بحث کلمۂ طیبہ پر ہے اور مقصود توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال ہے۔ آخر میں چند اوراق میں نماز کی دین میں اساسی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اور ترکِ صلوٰۃ کے ایمانی خطرے سے آگاہ کیا گیا ہے۔ ایسے مضامین کو پڑھنا اور پھیلانا چاہئے۔

بعض ارشادات ہمارے ناقص فہم میں سوالات پیدا کر گئے، مثلاً ایک جملہ ہے: "یہ روح (عجز و تذلل) نماز، صدقہ، روزہ، دعا، استغفار، استعانت وغیرہ میں اگر ناپید ہو جائے تو یہ افعال عبادت نہیں ہوں گے۔" (ص ۱۱) سوال یہ ہے کہ یہاں دعوت الی اللہ، سعی غلبہ دین، ہجرت اور جہاد جیسی عبادت کا کوئی حوالہ کیوں نہیں؟ غنیمت ہے کہ آگے ص ۱۰ پر روئے سخن کچھ ادھر بھی ہوا ہے۔ پھر یہ بات کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت اور شدید محبت کے لائق نہیں (ص ۱۲) اس میں ذکر اطاعت کیوں شامل نہیں؟ پھر یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ "رب، خالق، مالک، رازق وغیرہ تمام صفات کو قرآن مجید اللہ کی پہچان اور معرفت کے لئے لاتا ہے" (ص ۲۱)

حالانکہ صفاتی اسماء کی یہ اہمیت بھی ہے کہ ان کا فہم آدمی کو "شرک فی الصفات" سے بچاتا اور اللہ کے بہت سے حقوق کو واضح کرتا ہے۔ صفات سامنے نہ ہوں تو محض اسم ذات (اللہ) سے تو کوئی متعین نقطۂ نظر بنتا ہی نہیں۔

امید ہے کہ ان اشارات کو ہمارے بزرگ مؤلف گستاخی پہ محمول نہ کریں گے۔

تحذیر المسلمین عن کید الکذبین

افادات مولینا اللہ یار خاں

مرتبہ: حافظ عبدالرزاق ایم اے

مجلد صفحات ۲۸۶ قیمت ۵ روپے

ملنے کا پتہ واضح طور پہ درج نہیں

اس کتاب کا ایک خاص موضوع ہے وہ ہے شیعہ عقاید و کلامیات کی تنقیح۔ اس خاص میدان میں اپنی معلومات بڑی محدود ہیں البتہ اس کتاب کو پڑھ کر ایک سوال ضرور پیدا ہو جاتا ہے کہ شیعہ حضرات کو ہم اس تصور کے تحت ملت اسلامیہ ہی کا ایک حصہ سمجھتے ہیں کہ ان کو دوسروں سے کچھ اختلافات ہیں اور اختلاف رکھنے کا حق سب کو ہے مگر اس کتاب کی بحثوں کے مطابق بات اختلافات تک محدود نہیں نظر آتی۔ بلکہ لاینحل تضادات سامنے آتے ہیں۔ ہماری تمنا یہ ہے کہ شیعہ اور سنی دونوں گروہوں کے علماء حضرات اس بات کی سعی بلیغ کریں کہ فاش قسم کے اعتقادی اور کلامی تضادات نہ رہیں صرف تفصیلات و تشریحات میں اس حد تک گوارا اختلافات باقی رہ جائیں کہ شیعہ اور اہل سنت دونوں گروہ ایک ہی دین و نظام کے علمبرداروں کی حیثیت سے ہم قدم بنکر جادہ پیما ہوں۔

میری رائے میں یہ کتاب نہ صرف معلومات افزا ہے بلکہ فی الجملہ اچھے اسلوب سے لکھی گئی ہے اور اس کا انداز فرقہ وارانہ نزاع کا سا نہیں ہے۔ بیجا الزام تراشی اور مبالغہ آرائی نہیں ہے اور نہ طنز و تعریض کا رنگ اختیار کیا گیا ہے۔ جزوی حد تک کہیں تھوڑی بہت اونچ نیچ کا ہونا بہت زیادہ قابل گرفت نہیں ہے۔

سیارہ ڈائجسٹ

چودہ صدیاں نمبر۔ حصہ اوّل

ایڈیٹر: عطش درانی

پتہ: ۲۴۴ ۔حمید نظامی روڈ۔ لاہور

صفحات قریباً ۵ سو

قیمت: ۲۵/- روپے

سیارہ ڈائجسٹ کا قرآن نمبر، رسول نمبر اور دوسرے متعدد خاص نمبروں کی تاریخ سامنے رکھیں تو اس تازہ خاص نمبر کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی ۱۴ صدیوں کی تاریخ بہت بڑا دفتر ہے۔ جس کو ملخصاً پیش کرنے کے لیے بھی چار پانچ سو صفحے کافی نہیں۔ اسی لیے ادارے نے پروگرام چودہ صدیاں نمبر کے ۳ حصوں کا بنایا ہے۔ ان میں سے پہلا حصہ شائع ہو گیا ہے۔ اس حصے میں سائنس، علوم اور ثقافت کے موضوعات کو سمیٹا گیا ہے۔ اردو، عربی اور انگریزی کی بہت سی کتابوں سے استفادہ کر کے مختلف موضوعات پر مختلف علماء، مفکرین، صحافیوں اور معلموں اور ادیبوں نے مضامین لکھے ہیں۔ خصوصی اہمیت یہ ہے کہ نمبر میں بہت سی تصویریں، تعمیرات اور خطاطی کے نمونے، سائنسی ایجادات اور نجوم و جغرافیہ کی دریافتوں کے متعلق نقشے اور خاکے شامل ہیں۔ ہر موضوعِ تحریر کے لیے ایک الگ حصہ خاص اندرونی سرورق سے الگ کیا گیا ہے، نیز ہر حصے کے آخر میں موضوع سے متعلق کتب حوالہ اور کتبِ مطالعہ کی ایک فہرست دی گئی ہے۔ سن عیسوی اور سن ہجری کے ایام اور تاریخوں کی دریافت کے لیے ایک جدید ترین تقویم اس کے آخر میں شامل ہے جس میں مختلف کیلنڈروں اور تقویموں کا مطالعہ کر کے واضح کیا گیا ہے کہ یہ نئی تقویم صحیح تر ہے۔

تفصیلی تبصرہ کرنا تو کجا، یہاں مضامین اور ان کے لکھنے والوں کا تذکرہ بھی مشکل ہے۔ مختصراً میں یہ کہتا ہوں کہ چودہ صدیاں نمبر ایک ایسا آئینہ ماضی ہے جس میں ہم اپنا تہذیبی چہرہ پہچان کر اپنے آپ پر اعتماد کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ مغربی تسلط کے جادوگر کا ہم پر سب سے بڑا ستم یہی ہے کہ اس نے ہماری ملی خود اعتمادی کو تہس نہس کر دیا ہے۔ اور ہم ایک طرح کی خود بیزاری اور غیر پرستی میں مبتلا ہیں۔ ہم اپنی صورت دوسروں کے آئینوں میں دیکھتے ہیں۔ اور اگر وہ طلسمی آئینے ہمارا حلیہ بگاڑ کر پیش کرتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو ہر قسم کے حسن و جمال سے محروم سمجھتے ہیں اور دوسروں کے تہذیبی چہرے ہمیں بڑے خوشنما لگتے ہیں۔ یہ نمبر ہمارے لیے اور نوجوانوں کے لیے اپنا تیار کردہ ایک ایسا آئینہ ہے جو ہم پر ہمارے تہذیبی حسن و جمال کو واضح کرتا ہے جس کو دیکھ کر دوسروں کے بنائے ہوئے حلیہ بگاڑ آئینوں کے طلسم سے ہم آزاد ہو سکتے ہیں۔ بس اس نمبر پر ہمارا یہی تبصرہ ہے۔
